بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور

بعثتِ محمدی ﷺ کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز

اِنقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر:

——— ڈاکٹر اِسرار احمد ———

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اشاعتِ خاص (اعلیٰ سفید کاغذ مجلّد)	-/۲۵ روپے
اشاعتِ عام (نیوز پرنٹ غیر مجلّد)	-/۸ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، پروفیسر حافظ محمد فاضل، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۹ | اکتوبر ۱۹۹۰ء - ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ | شمارہ ۱۰

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

پاکستان کا ہر باشعور شہری جانتا ہے کہ ہمارا ملک اس وقت شدید قسم کے خطرات سے دوچار ہے۔ ایک جانب ملک کی داخلی صورتِ حال انتہائی غیر تسلی بخش ہی نہیں نہایت تشویشناک ہے۔ پاکستان میں بسنے والے لوگوں کے مابین علاقائی، لسانی اور سیاسی بنیادوں پر اختلافات اب نفرتوں اور عداوتوں کے ایک ایسے سیلاب میں تبدیل ہو چکے ہیں جس کا رُخ موڑنا بظاہر احوال ناممکن نظر آتا ہے۔ اور دوسری جانب پاکستان کی سرحد پر دو اطراف سے دشمن گویا حملہ آور ہونا ہی چاہتا ہے۔ ملک کے داخلی حالات کے پیشِ نظر دشمنوں کو خوب اندازہ ہے کہ پاکستان پر کاری ضرب لگانے کا ایسا موقع شاید ہی پھر کبھی ہاتھ آئے۔ پھر بھارت کے اندرونی حالات بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ فی الوقت وہاں کی قیادت کو بھی کشمیر کے معاملے میں پاکستان سے آخری لڑائی لڑنے ہی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا اہلِ پاکستان کے لیے اللہ کے آخری فیصلے کا وقت شاید آپہنچا ہے ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ ٹل جائے!

حقیقت یہ ہے کہ ہم اہلِ پاکستان اپنی بداعمالیوں سے خود کو کبھی کا اللہ کے عذاب کا مستحق بنا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کے طفیل ہماری رسی دراز ہوتی چلی گئی۔ اُن چھوٹے چھوٹے بے شمار عذابوں کا مزا چکھنے کے باوجود جو ہمیں جھنجھوڑنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جاتے رہے، ہم نے اصلاحِ احوال کی جانب رتی بھر توجہ نہ کی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ تاہم قدرت کی طرف سے ہمیں مزید ڈھیل ملتی چلی گئی اور ہم

"وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ"

کا مصداق بنتے چلے گئے۔ اور اب ہم صریحاً اللہ کے عذاب کی زد میں ہیں اور شدید اندیشہ ہے کہ "دَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا" کی سنتِ الٰہی ہمارے حق میں پوری ہو کر رہے گی۔

مزید تکلیف دہ بات یہ ہے کہ قوم بحیثیتِ مجموعی "احساسِ زیاں" سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ ہر کسی کو اگر کوئی فکر ہے تو بس اپنی مصروفیات، اپنے مشاغل، اپنی اغراض اور اپنے مفادات کے بارے میں ہے۔ ذاتی مفادات و اغراض سے بلند تر ہو کر سوچنے کی صلاحیت عوام ہی میں نہیں ارباب سیاست و حکومت میں بھی مفقود نظر آتی ہے۔ ملک و ملّت کے بارے میں سنجیدہ انداز میں غور و فکر کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت ہے نہ اس کی ضرورت کا کوئی احساس! گویا ہم مسلمانانِ پاکستان ہر اعتبار سے "یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری" کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

کچھ توقع اگر تھی تو اُن دینی جماعتوں سے تھی جنہوں نے ملتِ اسلامیہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کو اپنی منزل قرار دے رکھا ہے کہ وہ وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ملت کی کشتی کو اس مہیب گرداب سے نکالنے کے لیے مل جل کر کوئی لائحہ عمل بنائیں گی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ــــــ انہیں الیکشن میں اپنی سیٹوں کے حساب کتاب بلکہ چھینا جھپٹی سے فرصت نہیں۔ الیکشن کے اس ہنگامے میں سیٹوں کے معاملے میں جو تیوں میں جس طرح سے دال بٹ رہی ہے اس نے دینی عناصر کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی ہے۔

ہاں ایک مردِ درویش ہے جسے بصورتِ حال خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ وہ اپنی بساط بھر لوگوں کو اجتماعی توبہ کی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنے احساسات لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا ہے لیکن تادمِ تحریر اس نقارخانے میں اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ قارئین جان گئے ہوں گے کہ ہمارا اشارہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس اور تنظیم اسلامی کے داعی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی جانب ہے جو پچھلے تین ماہ سے گویا پکار پکار کر لوگوں کو اس ہولناک انجام کی جانب متوجہ کر رہے ہیں جس سے عالم عرب اور مسلمانانِ پاکستان دوچار ہونے والے ہیں۔ عذابِ خداوندی "ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی مانند گویا تُلا کھڑا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اپنے حالیہ خطباتِ جمعہ اور خطابِ عام میں قومِ یونسؑ کے حوالے سے اس بات کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ اس مہیب صورتِ حال سے نکلنے کی واحد سبیل اجتماعی توبہ کی جانب متوجہ ہونا ہے۔ جس طرح حضرت یونسؑ کی قوم سے عذاب کے واضح آثار شروع ہونے کے

باوجود اجتماعی توبہ کے سبب سے عذاب ٹال دیا گیا تھا اسی طرح ہم آج بھی اجتماعی توبہ کے ذریعے اللہ کی رحمت کو آواز دے سکتے ہیں۔ اللہ کی رحمتِ خصوصی اگر ہماری دستگیری فرمائے تو ہم اِس خوفناک صورتِ حال سے نکل سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ابھی تک ہمارا معاملہ تو یہ رہا ہے کہ:

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا — پر تُو نے دِل آزردہ ہمارا نہ کیا!
ہم نے تو جہنّم کی بہت کی تدبیر — لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا!!

تاہم اللہ کی رحمتِ خصوصی کو دعوت دینے کی واحد صورت اجتماعی توبہ کی ہے۔ قوم کا ایک قابلِ ذکر حصّہ اگر خلوصِ دل کے ساتھ اور اپنی سابقہ غلط کاریوں پر ندامت و پشیمانی کے جذبات کے ساتھ اللہ کی جناب میں رجوع کرے تو اس تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ——— لیکن اس کے ساتھ ہی اجتماعی توبہ کا ایک تقاضا اور بھی ہے[1]۔ ہمیں اپنی اُس اجتماعی تقصیر کی تلافی بھی کرنی ہوگی جس کا ارتکاب کرتے ہمیں اب نصف صدی ہونے کو آتی ہے۔ ۴۴ سال قبل ہم نے بحیثیتِ قوم اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر ہم مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند کو ایک خطۂ زمین عطا کرے تو ہم اسے اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک نمونہ بنا دیں گے۔ بالفاظِ دیگر اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کو نافذ و قائم کر کے ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ دنیا کو دکھا دیں گے۔ پروردگار نے ہمیں پاکستان کی شکل میں ایک خطۂ زمین عطا کر کے گویا ہماری دعا قبول فرمالی اور فَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کے مصداق ہمیں یہ موقع فراہم کیا کہ ہم اپنے وعدے کو پورا کریں ——— ہم پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کو کیا نافذ و غالب کرتے، پچھلے ۴۴ سالوں کے دوران ہم نے اسلام کے عائلی نظام میں بھی نقب لگا کر گویا 'بچے کھچے دین' کا بھی حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

مقامِ عبرت ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جب یہ اندازہ ہوا ہے کہ وہاں کی حکومت اُن کے عائلی نظام میں شگاف ڈالنے پر تُلی ہوئی ہے تو وہ حکومت کے ناپاک

---

[1] اِس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک مفصل خطاب اگست ۱۹۶۰ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکا ہے۔

عزائم کی راہ میں آہنی دیوار بن گئے۔ انہوں نے دینی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ہر نوع کی قربانیاں دے کر یہ ثابت کیا کہ وہ اس معاملے میں کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ لیکن حکومت کا اقدام انہیں کسی صورت گوارا نہیں۔ چنانچہ کانگریس کی حکومت کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے بنی ـــــ دوسری طرف اپنا حال دیکھئے کہ پاکستان میں ۱۹۶۲ء سے خلاف اسلام عائلی قوانین نافذ ہیں لیکن دینی عناصر کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مل جل کر اُس کے خلاف کوئی مؤثر تحریک چلا سکیں!

ہمارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ اِن کردہ گناہوں کی سزا شاید اب ہمیں ملنے ہی والی ہے۔ ہاں اللہ کی رحمت اگر ہمیں اپنی آغوش میں لے لے تو بات دوسری ہے! لیکن اس کی رحمت تک رسائی اجتماعی توبہ ہی کے ذریعے ممکن ہے: سورۃ الزمر کی یہ آیت بہت ہمت افزا ہے: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشنے والے ہیں لیکن ہم توبہ و استغفار کی راہ اختیار تو کریں! معاملہ تو یہ ہے کہ ع "ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!" ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں میں یہ احساس اجاگر کیا جائے، انہیں اجتماعی توبہ پر آمادہ کیا جائے اور پھر اس توبہ کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام و نفاذ کے لیے نیک نیتی کے ساتھ مل جل کر جدّ و جہد کا آغاز کر دیا جائے۔ اس معاملے میں موجود الوقت دینی عناصر کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ یہ مسئلہ اب محض ہمارے دین و ایمان ہی کا نہیں زندگی اور موت کا بھی ہے۔ اسے اگر اوّلیّت نہ دی گئی تو شدید اندیشہ ہے کہ "دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!"۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے حالیہ خطابات میں قربِ قیامت کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے متعدد مواقع پر مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مقالے کا حوالہ دیا ہے جس کے ذریعے احادیث کی روشنی میں قربِ قیامت میں ہونے والی عظیم جنگوں کی کچھ تفصیلات سامنے آتی ہیں ـــ اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم اُن خوفناک جنگوں کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں۔ خواہش یہ تھی کہ وہ مفصّل مقالہ اگر دستیاب ہو جاتا تو اُسے

(باقی صـ۱۴ پر)

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

امثال القرآن

قرآنِ حکیم کا ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ اس میں تمثیلات بکثرت وارد ہوئی ہیں' اور جن کی نگاہ سابقہ کتبِ سماویہ بالخصوص انجیل پر بھی ہے وہ جانتے ہیں کہ تمثیلات کے ذریعے ابلاغ و تفہیم تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے اور انجیل میں تو یہ وصف انتہا درجے کو پہنچا ہوا ہے۔

اِن تمثیلات کی حکمت کے ضمن میں قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات پر وضاحت کی ہے کہ ان سے مقصود یہ ہے کہ لوگ غور و فکر سے کام لیں اور تعقّل و تفکّر کی روش اختیار کریں۔ مثلاً سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ "اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں"! اسی طرح سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۳ میں ارشاد ہوتا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ "اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن اُنہیں صرف اصحابِ علم ہی سمجھ پاتے ہیں"! اسی طرح سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے: وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ "اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ انہیں یاد دہانی حاصل ہو سکے"! اس موضوع پر قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں ہے' جہاں ارشاد ہوتا ہے: وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ "اور اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے اور خود وہ تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے"! یعنی تمثیل کی ضرورت انسانوں کو ہے' اللہ کو نہیں۔ اللہ کو تو ہر چیز کا کما حقّہٗ اور کما ہی علم حاصل ہے اور وہ ہر چیز کی اصل کُنہ سے پوری طرح باخبر ہے۔ البتہ بعض مشکل اور لطیف حقائق کے ضمن میں جن کے کامل ادراک سے عقلِ انسانی عاجز رہ جاتی ہے' انسان کی ضرورت کے تحت تمثیلات بیان کی جاتی ہیں۔

انجیل میں ہے کہ ایک بار حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک شاگرد نے آنجنابؑ سے استفسار کیا کہ "اُستاد! آپ تمثیلوں میں کیوں کلام کرتے ہیں"؟ جس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا:

"تاکہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہو!" یہ تمثیلوں کی حکمت کا دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ بعض اعلیٰ علمی مضامین جن کا فہم صرف اصحابِ دانش ہی کے لیے ممکن بھی ہو اور مفید بھی تمثیلات کے پیرائے میں بیان کر دی جائیں تاکہ وہ تو اُن کے ذریعے پوری بات کو پالیں لیکن عوام الناس جو اِن اعلیٰ علمی حقائق کا تحمّل نہ کر سکتے ہوں اور جن کے اُن کے ذریعے بہک جانے کا امکان ہو وہ اُن پر سے سرسری طور پر گزر جائیں اور اس طرح فتنے میں پڑنے سے بچ جائیں۔

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۶ میں ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل بیان ہوئی ہے جس میں ایک صاحبِ علم و فضل انسان کے حرص و ہوا کے دام میں پھنس کر اخلاقی پستیوں میں مبتلا ہو جانے کو کُتّے سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے اور اُس کی زبان نکلی ہی رہتی ہے اور وہ چلتا ہے تو ہر دم زمین کو سونگھتے ہوئے ہی چلتا ہے کہ شاید کہیں کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس تمثیل کے صحیح فہم اور اُس کی فصاحت و بلاغت کا کسی قدر اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آیات ۱۷۵ تا ۱۷۷ کا ترجمہ سامنے رکھا جائے جو یہ ہے:

"اور اے نبی! اِن لوگوں کو اُس شخص کا حال سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیات عطا فرمائیں لیکن وہ اُن سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا اور بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اُسے اُن آیات کے ذریعے رفعت و بلندی مرحمت فرماتے۔ لیکن وہ تو زمین ہی کی جانب جھکتا چلا گیا اور اس نے اپنی خواہشات و شہوات کی پیروی اختیار کر لی۔ تو اس کی مثال کُتّے کی سی ہے کہ اگر تم اس پر بوجھ ڈالو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے اور اگر چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ پس (اے نبی!) انہیں سرگزشت سنایئے شاید کہ وہ غور کریں۔ بُری ہے مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا!"

یہ آیات سورۃ الاعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور بنی اسرائیل کے طویل تذکرے کے فوراً بعد وارد ہوئی ہیں اور ان کے ذریعے کسی مسلمان اُمّت کے زوال، اضمحلال، اور فساد و بگاڑ کا نقشہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی حامل اور آیاتِ الٰہی کی امین ہونے کے باوصف لذّتِ دُنیوی اور خواہشات و شہواتِ نفسانی سے مغلوب ہو کر بالکل کُتّے کی سی کیفیّت کی حامل ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ یہی مضمون سورۃ الجمعہ میں بھی وارد ہوا ہے، جہاں ایسی قوم کو جو حاملِ کتابِ الٰہی بنائی گئی ہو، لیکن اُس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے، ایسے گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ط "اُن لوگوں کی مثال جو حاملِ تورات بنائے گئے تھے، پھر انہوں نے اسے نہ اُٹھایا، اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو"۔

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۶ میں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ایک شخص کی مثال بیان کی گئی ہے۔ اکثر مفسرین کا اجماع ہے کہ اس کا نام بلعام بن باعورا تھا۔ یہ بنی اسرائیل کا ایک نہایت عالم و فاضل اور عابد و زاہد انسان تھا اور بنی اسرائیل میں اس کا بڑا اثر تھا۔ لیکن ایک عورت کے اغواء و اضلال کے نتیجے میں گویا شہوت سے مغلوب ہو کر یہ پستیوں کی جانب چل نکلا اور اس کا سارا علم و فضل اور زہد و ورع ختم ہو کر رہ گیا۔

اس آیۂ مبارکہ میں "وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" کے الفاظ بہت قابلِ توجہ ہیں۔ اس لیے کہ انسان کا وجود مرکب ہے دو وجودوں سے ——— ایک وجودِ حیوانی جو زمین کی مٹی ہی سے بنا ہے اور اسی سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اور اس کی جانب اس وجود کی پوری توجہ مرتکز رہتی ہے۔ اور دوسرا وجودِ روحانی جو علوی الاصل ہے، اس لیے کہ روح کی نسبت ذاتِ الٰہی سے ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ "اور (اے نبی) یہ آپ سے رُوح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے! کہ رُوح میرے ربّ کا امر ہے"! اسی طرح دو مقامات پر فرمایا گیا: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ "اور جب میں اُسے پوری طرح بنا کر تیار کر دوں اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر پڑنا اس کے آگے سجدے میں"!

الغرض روحِ انسانی کی نسبت ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب! اس طرح اس کی تغذیہ و تقویت کا سامان بھی آسمانی ہی ہے یعنی کلامِ ربّانی۔ اور اگر کلامِ ربّانی کے ذریعے اس کو تقویت حاصل ہو جائے تو اس کی پرواز ہوتی ہے عالمِ ملکوت کی جانب، جسے یہاں تعبیر کیا: "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا" کے الفاظ سے۔ مطلب یہ کہ ہم نے تو اسے اپنی آیات عطا فرمائی تھیں اور اُس

کے لیے رفعتوں اور بلندیوں کا راستہ کھول دیا تھا لیکن وہ بدنصیب اور بدبخت انسان زمینی خواہشات اور شہوات ہی کی جانب جھکتا چلا گیا ـــــ نتیجۃً شیطان کو اس پر پورا تسلط حاصل ہو گیا اور اس نے اسے گمراہی کی آخری حدوں تک پہنچا کر دم لیا۔ اب اس کی کیفیت کتے کی سی ہو گئی ہے، جس میں حرص کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ جب چلتا ہے تو خواہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہی کیوں نہ ہو، لازماً زمین کو سونگھتے ہوئے ہی چلتا ہے کہ شاید کہیں سے کوئی چیز اور ایسی مل جائے جسے پیٹ میں ڈال لے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان ہر وقت نکلی ہی رہتی ہے اور اس کی رال ہر وقت ٹپکتی ہی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی کنکر یا کوئی دوسری چیز اُسے ماری جائے تو اسے بھی ایک بار تو لپک کر پکڑ لیتا ہے، اور سونگھتا ہے کہ شاید یہ بھی کوئی کھانے ہی کی چیز ہو۔

آخر میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ مثال ہے اُس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ واضح رہے کہ یہاں جھٹلانا سے مراد زبان سے جھٹلانا نہیں، عمل سے جھٹلانا ہے۔ چنانچہ یہی الفاظ آئے ہیں سورۃ الجمعہ کی متذکرہ بالا آیت کے آخر میں بھی کہ: بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ "بُری ہے مثال اُن لوگوں کی جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں"۔ اب ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل نے تورات کی زبان سے تکذیب کبھی نہیں کی۔ اُن کی تکذیب عملی تھی یعنی اُن کا عمل ایسا تھا جس سے وجودِ تورات کی تکذیب ہو جاتی تھی۔ افسوس کہ بعینہٖ یہی حال اس وقت اُمّتِ مسلمہ کا ہو چکا ہے کہ زبان سے تو قرآن مجید پر ایمان کا دعویٰ ہے لیکن عمل سے اُسے جھٹلایا جا رہا ہے۔ زبانی دعویٰ تو یہ ہے کہ قرآنِ حکیم مکمّل ضابطہ حیات ہے اور کامل ہدایت نامہ ہے۔ لیکن عمل سے ہم دُنیا کے سامنے جو شہادت پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن میں زندگی کے عملی معاملے کے لیے کوئی رسائی موجود نہیں ـــــ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اور اس طرزِ عمل کا اصلی سبب ظاہر ہے کہ وہی ہے جو اس آیت میں دی گئی تمثیل میں بیان ہوا یعنی لذّاتِ دُنیوی کی طلب اور خواہشات و شہواتِ نفسانی کا غلبہ! اللہ تعالیٰ ہمیں ان دونوں لعنتوں سے نجات عطا فرمائے اور قرآنِ حکیم کو عملی طور پر اپنا امام و رہنما بنانے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ ہم دوبارہ دینی و دنیوی دونوں طرح کی رفعتوں سے ہم کنار ہو سکیں۔ جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ "اللہ تعالیٰ اس کتاب یعنی قرآنِ حکیم کی بدولت قوموں کو سربلندی عطا فرمائے گا، اور اس کو ترک کرنے کے باعث ذلیل و رسوا کر دے گا"۔ (رواہ مسلم)

سورۃ البقرۃ آیات ۲۳۴ تا ۲۳۹

وفات کی عدّت

شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کا زندگی کا سہاگ لُٹ جاتا ہے۔ اس کی طبیعت بناؤ سنگار کو پسند نہیں کرتی ہے۔ شادی بیاہ کے لیے نامہ و پیام سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ کی ہدایت نے طبیعت کا لحاظ کرکے وفات کے بعد ایک مدّت مقرر کردی اور اس کو قانون و فرض کا درجہ دیا۔ اس مدّت میں حکم ہے کہ وہ خود بھی بناؤ سنگار سے رُکی رہے اور دوسرے لوگ بھی شادی بیاہ کے نامہ و پیام سے باز رہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ
بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ
اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى
يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ
فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

اور تم میں سے جن کا انتقال ہو جائے اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیویوں کو چار مہینے دس دن خود کو روکے رکھنا چاہیے، پھر جب وہ اپنی یہ مدّت پوری کرلیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں ہے جو وہ اپنے حق میں قاعدہ قانون کے مطابق کریں۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور تم

پر اس میں گناہ نہیں ہے کہ ان عورتوں کو اشارہ کنایہ سے نکاح کا پیغام پہنچاؤ یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر تذکرہ کرو گے۔ لیکن (ایسا نہ ہونا چاہیئے) کہ پوشیدہ طور پر ان سے نکاح کا وعدہ لے لو۔ بلکہ جو کچھ کہو وہ رواج کے مطابق ہو[2]۔ اور جب تک اللہ کی کتاب میں دی ہوئی مدت (۴ ماہ ۱۰ دن) پوری نہ ہو جائے اس وقت تک ان سے نکاح کا ارادہ نہ کرو۔ اور جان لو کہ اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔

[1] نکاح ایک نہایت معزز و پاکیزہ رشتہ ہے جو شوہر و بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر فوراً ہی دوسرے رشتہ کی اجازت دے دی جائے تو اس کی بے وقعتی ہوگی اور اس کے ذریعہ دونوں کے درمیان جو پیار و محبت قائم ہوتا ہے اس کی توہین ہوگی۔ پھر ایسی مدت ضروری ہے جس میں حمل کا انتظار ہو جائے اور کوئی شبہ نہ باقی رہے۔

[2] یہ انسان کی طبعی خواہش کا ذکر ہے جس کا شریعت نے لحاظ کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی قاعدہ قانون سے آزاد نہیں رکھا ہے بلکہ رواج اور شریعت کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔

طلاق کے بعد بھی فائدہ پہنچانا

اللہ کی ہدایت ہر معاملہ کو انسانیت کی اونچی سطح سے دیکھتی ہے۔ اس کا پورا نظام ہی ایک دوسرے کے ساتھ احسان و سلوک اور محبت و مروت پر قائم ہے، چنانچہ نکاح کا رشتہ ٹوٹنے (طلاق) کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ احسان و سلوک کا حکم ہے ـــــ یہ رشتہ خواہ میاں بیوی کے درمیان تعلق قائم ہونے کے بعد ٹوٹے یا پہلے ٹوٹے۔ ان آیتوں میں پہلے ٹوٹ جانے کے احکام ہیں۔

نکاح کا رشتہ میاں بیوی دونوں کی اخلاقی آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ قدم قدم پر تحمل و برداشت اور فراخ حوصلگی کا دونوں سے مطالبہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو دو

دن نباہ مشکل ہے۔ یہ رشتہ عموماً رنجشوں اور ناگواریوں کی فضاء میں ٹوٹتا ہے' اس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان وسلوک نہایت مشکل کام ہے۔ اس میں بڑی نفس کشی کرنی پڑتی اور اپنی مرضی وخواہش کی قربانی دینی پڑتی ہے جس کے لیے اللہ سے خصوصی تعلق کی ضرورت ہے۔ آگے کی آیتوں میں نماز کی حفاظت کا حکم اسی تعلق کو پیدا کرنے کے لیے ہے۔ نماز اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے' بشرطیکہ اس کی ادائیگی ٹھیک ٹھیک ہو۔ اسی بنا پر صلوٰۃ وسطیٰ (بہترین نماز) کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ عام نمازوں میں وہ تاثیر نہیں ہے جو اللہ سے خاص تعلق پیدا کرکے انسان کی سطح کو بلند کردیں اور پھر وہ اپنی مرضی وخواہش کو قربان کرنے پر آمادہ ہوجائے۔

نکاح وطلاق کے بیان میں عبادت کا ذکر خاص طور سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی ہدایت میں قانون واخلاق، عبادات ومعاملات اور معاشرت کے احکام ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے، جڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

لَاجُنَاحَ

عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ
تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ
قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ
تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ
النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ
بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوْا عَلَى
الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾

"تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان عورتوں کو طلاق دو جن کو تم نے ہاتھ نہیں لگایا (تعلقات نہیں قائم ہوئے) اور جن کا مہر بھی مقرر نہیں کیا۔ (طلاق کے بعد) تم ان کو فائدہ پہنچاؤ، مالدار اپنی حیثیت کے مطابق اور مفلس اپنی حیثیت کے مطابق — فائدہ پہنچانا شریفانہ رواج کے مطابق نیک کردار لوگوں کے ذمہ واجب ہے[1] اور اگر تم انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو اور ان کا مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر ادا کرنا ہے۔ ہاں اگر عورتیں معاف کر دیں (آدھا مہر بھی نہ لیں) یا مرد معاف کر دے (پورا مہر ادا کر دے) جس کے ہاتھ میں نکاح کا رشتہ ہے اور تمہارا (مرد کا) معاف کر دینا زیادہ تقویٰ سے لگتی بات ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان و بھلائی کرنا نہ بھولو[2] جو تم کر رہے ہو بلاشبہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور نمازوں کی حفاظت کرو — (خاص کر) بہترین نماز کی[3] اور اللہ کے سامنے عجز و نیازمندی سے کھڑے رہو۔ تمہیں اگر خوف ہو تو پیدل یا سوار جس حالت میں ہو نماز پڑھ لیا کرو۔ پھر جب مطمئن ہو تو اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اس نے تمہیں سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔"

---

[1] فائدہ پہنچانے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جس میں بڑی گنجائش ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مدد کر کے اعلیٰ کردار پیش کرے۔ آیت میں نیک لوگوں کو خاص طور سے متوجہ کیا گیا ہے کہ رنجشوں اور ناگواریوں کے باوجود اس حکم پر عمل کرنا ان کے لیے آسان ہے اور یہ ان کی نیک کرداری کا ثبوت بھی ہے۔ اللہ کی ہدایت کا سبھی سے اسی کردار کا مطالبہ ہے اور سبھی کو نیک بننے کی تاکید ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ غیر نیک لوگوں سے اس کا مطالبہ نہ ہو۔

۲؎ رنجشیں اور ناگواریاں ہزار سہی لیکن اپنے رویّہ اور کردار پر حرف نہ آنے دینا اور ہر حالت میں احسان و بھلائی کرتے رہنا ہی انسانیت کی اونچی سطح اور یہی اللہ کی ہدایت کا مطالبہ ہے۔

۳؎ صلوٰۃ وسطیٰ (بیچ کی نماز) کے بارے میں مفسّرین کے بہت سے قول ہیں۔ نماز عصر، نماز ظہر نماز فجر وغیرہ۔ لیکن موقع کی مناسبت سے بہترین نماز مراد لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جس کی مفسّرین کے اقوال میں بھی گنجائش ہے اور آگے "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" (اللہ کے سامنے عجز و نیازمندی سے کھڑے رہو) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ "بہترین نماز" سے وہ نماز مراد ہے جو ہر حیثیت سے ٹھیک ٹھیک ادا کی گئی ہو۔ اور جس کے اثرات زندگی میں نمایاں ہوں۔ یہی نماز برائیوں سے روک کر بھلائی پر آمادہ کرتی اور انسان کو اعلیٰ کردار کا نمونہ بناتی ہے۔

بقیہ : حرفِ اوّل

ہم قارئینِ حکمتِ قرآن، و 'میثاق' کی نذر کرتے۔ تاہم مولانا سیّد حامد میاںؒ ہی کا ایک مختصر مقالہ اس موضوع پر ہمارے ایک کرم فرمانے ارسال کیا ہے جس میں اگرچہ وہ تمام تفصیلات تو نہیں ہیں جس کا حوالہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطابات میں دیا ہے، لیکن اپنی جگہ یہ بھی ایک مفید مقالہ ہے۔ چنانچہ اسے شمارۂ ہذا میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے

قربِ قیامت کی بعض علامات

احادیثِ نبویّہ کی روشنی میں

از قلم: مولانا سیّد حامد میاں رحمۃ اللہ

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ۔ پ۲۵ سورۂ زخرف آیت ۶۱ ترجمہ: "اور وہ نشان ہے قیامت کا"۔

اس کی مختصراً تفسیر کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کا اوّل مرتبہ آنا تو خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا کہ بدون باپ کے پیدا ہوئے اور عجیب وغریب معجزات دکھلائے اور دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہوگا۔ ان کے نزول سے لوگ معلوم کرلیں گے کہ قیامت بالکل نزدیک آلگی ہے"۔

احادیث مقدسہ میں علاماتِ قیامت بہت بتلائی گئی ہیں۔ لیکن ان میں ترتیب کیا ہوگی اور ایک علامت سے دوسری علامت تک کتنا فصل ہوگا، اس کی صراحت بہت کم علامات میں فرمائی گئی ہے۔ حدیث کی سب کتابوں میں 'کتاب الفتن' موجود ہے اور اسمیں 'بابُ العلامات بین یدی الساعۃ' یعنی قیامت سے پہلے وجود میں آنے والی علامتوں کے باب موجود ہیں۔

علماءِ کرام کو حق تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے یہ بھی کوشش کی کہ یہ علامات یکجا کردی جائیں اور ان میں کیا ترتیب ہوگی وہ بھی ذکر کردی جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے مفید رسالہ وہ ہے جو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں بہت سی احادیث سے استفادہ کرکے ایک مضمون کی شکل دے دی ہے۔ اسی سے اقتباس کرکے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

قربِ قیامت کی علامات میں فسق و فجور بڑی علامت ہے ۔ اس کی تھوڑی سی تشریح عرض کرتا ہوں ۔

کفر اور فسق دو لفظ ہیں ۔ بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کفر کا تعلق عقیدہ سے ہے اور فسق کا تعلق فقط اعمال سے ہے ۔ کوئی آدمی خلافِ شرع کام کرتا ہو تو اسے فاسق کہا جاتا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فسق کا تعلق عقیدہ اور عمل دونوں سے ہوتا ہے ۔ عقیدہ کا فسق یہ ہے کہ انسان صحابۂ کرام کے بتلائے ہوئے عقائد سے ہٹ جائے ۔ جب وہ ان عقائد سے ہٹے گا تو فسق فی العقیدہ میں یعنی بدعتِ اعتقادی میں مبتلا ہو جائے گا اور کبھی کبھی یہ فسقِ فی العقیدہ کفر تک بھی پہنچا دیتا ہے ۔

صحابۂ کرامؓ کے بتلائے ہوئے عقائد وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں اور ان پہ ساری اُمت قائم چلی آ رہی ہے ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ معیارِ حق ہیں ۔ خروج ، شیعیت ، جہمیت ، اعتزال اور فرقہ ہائے جَبْرِیَّہ ، قَدَرِیَّہ ، مُرجِئہ ، کَرَّامِیَّہ سب اسی اصول سے ہٹنے سے پیدا ہوئے ۔ ان فرقوں میں بہت سے فرقے حدِ فسق تک گمراہی میں مبتلا ہوئے اور بہت سے حدِ کفر تک آگے چلے گئے ۔ جو طبقے صحابہ سے حدِ فسق تک ہٹے وہ بدعتی بھی کہلاتے ہیں ۔

غرض جس طرح اعمال میں فسق ہوتا ہے اسی طرح عقائد میں بھی ہوتا ہے ۔ ان دونوں کا فروغ علاماتِ قیامت میں ہے ۔

علاماتِ قیامت میں جو بداعمالیاں صراحۃً احادیث میں شمار کرائی گئی ہیں یہ ہیں :

ظلم کا اس قدر بڑھ جانا جس سے پناہ لینی مشکل ہو ۔ خیانت کا عام ہونا ۔ جواء ، شراب ، ناچ اور گانے کی کثرت ، مردوں کا ناجائز حد تک عورتوں کے مطیع ہونا ۔ اولاد کی نافرمانی ۔ نااہلوں کے ذمہ وہ کام لگانے جن کے وہ اہل نہ ہوں ۔ اپنے اسلاف پہ طعن ۔ مساجد کی بے حرمتی ۔ جھوٹ کو ایک فن کا درجہ دینا ۔ گانا گلوچ کی کثرت ۔ دلوں میں شرم و حیا ، امانت و دیانت کی کمی ، وغیرہ ۔

ظلم کا اس قدر بڑھ جانا جس سے پناہ لینی مشکل ہو ، اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ حکام ، انتظامیہ ، عدلیہ سب ہی ظالم ہو جائیں ۔ دوسرے یہ کہ آپس میں خانہ جنگی

ہو، جرم کسی کا ہو ماراکوئی اور جائے' یا اور اس قسم کی سورتیں۔

یہ سب باتیں ہر سلیم الفطرت شخص کے نزدیک معیوب ہیں اور اسلام میں کناہ حرام یا قابلِ تعزیر وحد ہیں۔ جس قوم میں یہ پائی جائیں وہ روبہ زوال ہو جاتی ہے اور بڑھ جائیں تو تباہ ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانوں (قرون وسطیٰ) میں بھی یہ باتیں پائی گئی ہیں لیکن افراد میں تھیں یعنی بہت کم۔ جب ان میں مبتلا لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پوری مسلم قوم پر زوال آگیا۔ حکومتیں چھنتی چلی گئیں حتیٰ کہ پوری دنیا میں کوئی بھی مسلم سلطنت اپنی آزادی پر قائم نہ رہ سکی۔

مذکورہ بالا خرابیوں کے پائے جانے پر عیسائیوں کے غلبہ کی خبر حدیث میں آئی ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"جب یہ تمام علامات و آثار نمایاں ہو جائیں تو عیسائی بہت ملکوں پر غلبہ کر کے قبضہ کرلیں گے۔"

اور ایسا واقعۃً ہو چکا ہے۔ دنیا بھر کی سب مسلم سلطنتیں تباہ ہو گئیں اور عیسائی چھا گئے۔ اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے:

—— کہ یہ خرابیاں تو ہماری قوم میں باقی تھیں پھر عیسائیوں کا غلبہ کیسے ہٹا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عیسائیوں کے مظالم زیادہ ہو گئے۔ انہوں نے پوری دنیا کو کھلونا بنا لیا اور غلامی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا۔ اور ظلم ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت ہدایت فرمائی تھی۔

وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ (بخاری شریف ج ا کتاب الزکوٰۃ)	اور مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ مظلوم کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (یعنی نہایت سریع التاثیر ہوتی ہے)۔

عیسائیوں کے پوری دنیا پر چھا جانے کے بعد سمٹ جانے کی وجہ لفظاً یہی ہے کہ ان کے مظالم بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے اقوامِ عالم کو محکوم ہی نہیں بلکہ انہیں غلام بھی بنا لیا تھا۔ الجزائر، ویٹ نام، کوریا وغیرہ سب ان کے کھلونے بنے رہے ہیں ۔۔۔ اور اسرائیل

کا ناسور ان ہی کا پیدا کردہ ہے۔

اگرچہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں وہ بھی دورِ فتن ہی ہے۔ طرح طرح کے فتنے نمودار ہو رہے ہیں۔ اتباعِ سلف کے بجائے اپنی خواہش پر چلنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جو شخص تھوڑا بہت علم حاصل کر لیتا ہے وہ تنقید و جرح کی وادیٔ پُرخار کی راہ لیتا ہے۔ صحابۂ کرام اور اسلاف کو چھوڑ کر اپنی شخصیت سازی میں لگ جاتا ہے۔ یہی وہ بیماری ہے جو سب فتنوں، بدعات اور اختلافات کی جڑ ہے۔ کثرتِ نشر و اشاعت نے اسے مرضِ متعدی بنا دیا ہے۔ ایک غلطی اور بدعت کی اصلاح نہیں ہونے پاتی کہ کوئی اور نئی بدعت کسی اور رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے یا کوئی نیا فرقہ باطلہ ابھرنے لگتا ہے۔ آخر اس دور کا منتہیٰ کہاں ہوگا۔

دورِ فتن سے احادیث میں ایسا زمانہ بھی مراد ہوتا ہے جس میں ایسی گڑبڑ ہو کہ عقلمند سے عقلمند شخص بھی حیران رہ جائے۔ ایک پہلو کی اصلاح ہونے سے پہلے دوسرے پہلو کی خرابی پیدا ہو جائے۔ یا ایک پہلو کی اصلاح میں دوسرے پہلو کی خرابی پیدا ہونے کا احتمال نظر آئے۔ اس دور میں بھی یہی حالت جا رہی ہے کوئی واضح راستہ کسی کے سامنے نہیں ہے۔ اور کوئی راہ بے خار نہیں رہی۔

لیکن احادیثِ مقدسہ کی روشنی میں یوں لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمان سنبھلتے ہی چلے جائیں گے کیونکہ انہیں عروج کی طرف جانا ہے۔ تقدیراتِ الٰہیہ ظہور میں آتی ہیں۔ مسلمان اگر خود نہ سنبھلے تو حالات سنبھلنے پر مجبور کر دیں گے۔ یہ ایک بہترین فاتح قوم بننے والی ہے۔ اگرچہ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ پوری طرح خود کفیل نہ ہو پائیں گے ــــ درمیان ہی میں دنیا کے حالات ایسے ہو جائیں گے کہ دنیا بھر کے مسلمان اور عیسائی آپس میں معاہدہ کریں اور کسی تیسری طاقت سے جنگ کریں اور فتح یاب ہوں۔ اب آنے والا طویل دور عروج کے ساتھ طویل عالمی جنگ کا بھی ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

حدیث شریف میں آتا ہے۔

عن مُعَاذ بن جبل قال قال — حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عُمْرَان بیت المقدس خراب یثرب وخراب یثرب خروج الملحمة وخروج الملحمة فتح القسطنطنیة و فتح قسطنطنیة خروج الدجال ثم ضرب بیدہ علی فخذ الذی حدثه او منکبه ثم قال ان ھذا الحق کما انك ھھنا او کما انك قاعد یعنی معاذ بن جبل	حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ بیت المقدس کی آبادی یثرب (مدینہ منورہ) کی بربادی ہوگی اور مدینہ شریف کی ویرانی جنگ کا پیش خیمہ ہوگی اور جنگ کا شروع ہونا قسطنطنیہ کی فتح ہوگا۔ اور قسطنطنیہ کا فتح ہونا دجّال کا خروج ہوگا پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے کندھے (مونڈھے) پر یا ران پر مارا پھر فرمایا کہ بلاشبہ یہ سب حق ہے۔ (یقیناً ہوگا) جیسے کہ تم یہاں موجود بیٹھے ہو۔ (یعنی معاذ بن جبل)
ابوداود شریف باب فی امارات الملاحم	

احادیث میں اکثر جگہ لفظ "فتنہ" سے آپس کی لڑائی اور خانہ جنگی مراد ہوتی ہے اور ملحمہ سے وہ لڑائی مراد ہوتی ہے جو مسلمانوں کی دوسروں سے ہو۔

اس وقت اسرائیل نے بیت المقدس کو دارالخلافہ بنالیا ہے اس لیے اس کی آبادی کا عروج تو شروع ہوگیا ہے۔

احادیث مقدسہ سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ عیسائیوں کا مذہبی یعنی عیسائیت کا مرکز "روم" ہوگا اور ممکن ہے مادی مرکز بھی اسی کو بنالیا جائے۔

مسلمان اور عیسائی دشمن پر فتح یاب ہونے کے بعد صرف دو آدمیوں کے جھگڑے کی وجہ سے ایک بات کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا کر معاہدہ توڑ دیں گے اور عیسائی مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے۔ صحابی نے فرمایا :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول	میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپؐ نے

ستصالحون الروم صلحا امنا فتغزون انتم وهم عدوًا من ورائكم فتنصرون و تغنمون وتسلمون ثم ترجعون حتى تنزلوا بمرج ذى تلول فيرفع رجل من اهل النصرانية الصليب فيقول غلب الصليب فيغضب رجل من المسلمين فيدقه فعند ذلك تغدر الروم وتجمع الملحمة

(ابوداؤد
باب مايذكرمن ملاحم الروم)

ارشاد فرمایا کہ عنقریب (ایسا وقت آئے گا کہ) تم اہل روم سے قابل اطمینان صلح کروگے۔ پھر تم اور وہ اپنے ایک دشمن سے لڑوگے۔ تمہیں نصرت و غنیمت حاصل ہوگی اور بچ بھی جاؤگے (سلامت رہوگے) پھر واپسی کے وقت ایک سبزہ زار میں جہاں ٹیلے ہوں گے ٹھہروگے۔ وہاں نصرانیوں میں سے ایک شخص صلیب بلند کرکے کہے گا کہ صلیب غالب آئی۔ اس پر مسلمانوں میں سے ایک شخص کو غصہ آئے گا وہ صلیب توڑ دے گا۔ اس وقت (صرف دو شخصوں کے جھگڑے پر) اہل روم (عیسائی) معاہدہ توڑ دیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہوجائینگے۔

اس لڑائی میں عیسائیوں کو کامیابی ہوگی مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوگا۔ وہ اپنا ہدف مدینہ منورہ کو بنائینگے۔ کسی لائن سے وہ خیبر تک پہنچ جائیں گے۔ مسلمانوں کا حکمران وفات پاجائے گا۔ اس وقت جو ہوگا وہ اس حدیث میں آتا ہے۔

عن ام سلمة زوج النبى صلى الله عليه وسلم عن النبى صلى الله عليه وسلم قال يكون اختلاف عند موت خليفة فيخرج رجل من اهل المدينة هاربًا الى مكة فيأتيه ناس من اهل مكة فيخرجونه

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمائی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایک خلیفہ کی وفات کے وقت اختلاف ہوگا تو ایک شخص (جو خلافت کا اہل ہوگا) مدینہ سے مکہ مکرمہ بھاگ جائے گا۔

وھو کارہ فیبایعونہ بین الرکن والمقام

ابوداؤد کتاب المھدی

اس کے پاس اہلِ مکہ آئیں گے۔ اسے (گھر سے) نکالیں گے۔ وہ اس معاملہ کو پسند نہ کرتا ہوگا (لیکن لوگ) ان سے رکن اور مقام کے درمیان بیعت کریں گے۔

اس وقت شام میں جو حاکم ہوگا وہ ان کی مخالفت میں لشکر روانہ کرے گا۔ حسد میں یا عیسائی حکومتوں کے ابھارنے پر جو صورت بھی ہو۔

ویبعث الیہ بعث من الشام فیخسف بھم بالبیداء بین مکۃ والمدینۃ

شام سے ان کے مقابلے کے لیے لشکر بھیجا جائے گا۔ اس لشکر کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع بیداء میں دھنسا دیا جائے گا۔

اسی مضمون کی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا:

یارسول اللہ کیف بمن کان کارھًا قال یخسف بھم ولکن یبعث یوم القیامۃ علی نیتہ

ابوداؤد کتاب المھدی

اے اللہ کے رسول اس لشکر والوں کے ساتھ جو لوگ مجبوری (مثلاً جبری بھرتی سے) آگئے ہوں گے ان کا کیا ہوگا! ارشاد فرمایا وہ بھی دھنسا دیئے جائیں گے لیکن ہر شخص قیامت کے دن اپنی نیت کے مطابق اٹھایا جائے گا۔

یعنی جو لوگ جبراً ساتھ لیے گئے ہوں گے ان کا حشر ان کی نیتوں کے مطابق ہوگا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی پہلی والی روایت میں ہے کہ:

فاذا رأی الناس ذلك اتاہ ابدال الشام وعصائب اھل العراق فیبایعونہ

جب لوگ یہ دیکھیں گے تو شام کے ابدال (اولیاء کرام) اور عراق کے (بہترین لوگ) گروہ در گروہ ان کے پاس آئیں گے اور ان سے بیعت ہوں گے۔

ان کی مدد کرنے والے اہل ماوراء النہر بھی ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

ارشاد فرمایا :

یخرج رجل من وراء النھر یقال	ایک شخص ماوراالنہر سے چلے گا اسے
لہ الحارث حرّاثٌ علی	حارث کہا جاتا ہوگا۔ وہ حرّاث (یعنی
مقدمۃ رجل یقال لہٗ منصورٌ	کاشت کرنے والا) ہوگا۔ اس کے لشکر
یوطئ او یمکن لآل محمد	کے اگلے حصہ مقدمۃ الجیش پر مامور
کما مکنت قریش لرسول اللہ	شخص کو منصور کہا جاتا ہوگا۔ وہ آل محمد
صلی اللہ علیہ وسلم وجب	صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کے مضبوطی
علی کل مؤمن نصرہ او	سے جمنے کے لیے مؤثر طرح کام کریگا۔
قال اجابتہ	جیسے (قبائل قریش نے اسلام قبول کرنے
(ابوداؤد کتاب المھدی)	کے بعد) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے (دین کے) لیے استحکام کا کام کیا۔ ہر ایمان والے شخص پر اس کی مدد واجب ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ماوراالنہر یعنی دریائے سیحون کے پار علاقوں میں اسلام نہایت جوش سے ابھر چکا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے :

ثم ینشأ رجل من قریش	پھر ایک قریش شخص ابھرے گا (اس
اخوالہ کلب فیبعث الیھم	کی ننھیال) اس کے ماموں بنو کلب
بعثا فیظھرون علیھم وذلک	ہوں گے۔ وہ حضرت مہدی کے مقابلہ
بعث کلب والخیبۃ لمن لم	کے لیے لشکر روانہ کرے گا۔ حضرت
یشھد غنیمۃ کلب	مہدی ان پر فتح پائیں گے۔ یہ لشکر
(ابوداؤد کتاب المھدی)	(درحقیقت) بنو کلب پر مشتمل ہوگا۔

جو ان کے اموال غنیمت نہ حاصل کرے وہ خسارہ میں رہا۔

حضرت امام مہدی علیہ رحمۃ اللہ ورضوانہٗ کے نام کے بارے میں ارشاد ہوا :

یواطئ اسمہ اسمی واسم ابیہ	ان کا نام میرے نام پر ہوگا اور ان
اسم ابی	کے والد کا نام میرے والد کے نام
(ابوداؤد کتاب المھدی)	پر ہوگا۔

حضرت مہدی کے ساتھ موعود کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جن کے ظہور کی اطلاع دی گئی ہے اور ان کا وجود اس وقت سارے مسلمانوں کی فلاح کا سبب ہوگا۔ اور اس کا احادیث میں وعدہ کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں بہت روایات موجود ہیں حتی کہ روایات میں حضرت مہدی کا حلیہ بھی بتایا گیا ہے۔

اجلی الجبھۃ اقنی الانف — کشادہ پیشانی بلند ناک۔

ایک اور روایت میں نسب بھی بتلایا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھکر ارشاد فرمایا:

ان ابنی ھذا سید کما سماہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسیخرج من صلبہ رجل یسمی باسم نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم یشبھہ فی الخُلق ولا یشبھہ فی الخَلق۔ (ابوداؤد شریف کتاب المھدی)	میرا یہ بیٹا سردار ہے جیسے کہ انہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (سید) فرمایا ہے اور ان کی نسل میں ایک شخص پیدا ہوگا۔ تمہارے نبی کا ہم نام ہوگا۔ عادات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوگا شکل و صورت میں نہیں۔

آپ کے متعلق تحریر کردہ رسائل میں یہ بھی ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے از غیب علم عطاء ہوا ہوگا جسے "علم لدنی" کہا جاتا ہے۔

یعمل فی الناس بسنۃ نبیھم صلی اللہ علیہ وسلم ویلقی الاسلام بجرانہ الی الارض (ابوداؤد کتاب المھدی)	لوگوں میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق عمل کریں گے اور اسلام بڑے سکون کے ساتھ ساری دنیا میں جم جائے گا۔

یہاں تک گذری ہوئی احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت جو دور جارہا ہے اس میں انشاء اللہ مسلمانوں کی بہتری ہوگی۔ اسلام کی طاقت بڑھے گی۔ مسلمانوں کی خرابیوں کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ مزید کمزوریاں جہاد کی برکت سے دور ہوتی جائیں گی۔ پورے عالم پر طویل ترین یا سخت ترین جنگ کا دور گذرے گا۔ مسلمان اور عیسائی قریب ہوں گے۔

اور آپس میں جنگی معاہدہ کریں گے۔ پھر وہ شدید ترین جنگ جو کسی تیسرے فریق سے ہوگی اس میں مسلم عیسائی متحدہ قوت کامیاب ہوگی۔ ان اتحادیوں کی کامیابی کے بعد پھر ذرا سی بات پر عیسائی معاہدہ منسوخ کر کے برسرپیکار ہو جائیں گے۔ مسلمان جو غالباً مادی طاقت میں ناکافی حد تک خودکفیل ہوئے ہوں گے شکست کھائیں گے اور بہت سے مسلم علاقے عیسائیوں کے قبضہ میں چلے جائیں گے جن میں ترکی، اردن اور سعودی عرب کا علاقہ صاف سمجھ میں آتا ہے پھر لڑائی کا زور اس علاقہ میں اور شام و فلسطین میں رہے گا۔ ان سب لڑائیوں میں جانی نقصان بے حد ہوگا۔ خدا ہی جان سکتا ہے کہ یہ جنگ کس قسم کی ہوگی کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ ایٹمی ہوگی یا دوسرے ہتھیاروں سے ہوگی۔ اس حصہ تک خوارقِ عادت کا ظہور نہ ہوگا۔ انسان نے اس وقت تک جو مادی ریڈیائی ترقی کی ہے یا کچھ اور کرے گا وہ آخری حد کو پہنچ چکی ہے یا پہنچ جائے گی۔ یہ ترقی بھی خوارق عادت کے مشابہ ہے۔ اس کے بعد ظہورِ مہدی سے روحانی خوارق کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت مہدی کا ظہور خلیفہ وقت کے انتقال پر ہوگا۔ وہ خود مہدی ہونے کا دعویٰ نہ کریں گے۔ لوگ پہچان کر انہیں خلیفہ بننے پر مجبور کر دیں گے۔ حضرت امام مہدی اسلامی افواج جمع کر کے حملہ آور عیسائیوں پر اپنے علاقے واپس لینے کے لیے جواباً حملہ کریں گے اور فتح کرتے کرتے ترکی تک پہنچیں گے جس وقت استنبول (قسطنطنیہ) فتح کریں گے، اس وقت انہیں ظہورِ دجال کی اطلاع ملے گی۔ اس لڑائی میں مسلمان فاتح ہوں گے لیکن اتنی بڑی تعداد میں شہید بھی ہو جائیں گے کہ فتح کی خاص خوشی نہ ہوا کرے گی۔ سو میں سے ایک آدمی زندہ رہ جائے گا۔ (مسلم ص ۳۹۲ ج ۲) (یعنی کسی کسی خاندان کا یہ حال ہوگا)۔

احادیث مقدسہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسی دوران یہودی بھی مسلمانوں سے لڑیں گے اور ہو سکتا ہے کہ یہ لڑائی حضرت مہدی کے اسی سفر جہاد میں شام سے ترکی جاتے ہوئے موجودہ (امریکہ کی ذیلی ریاست) اسرائیل میں ہو۔ اس کی خبر یوں دی گئی ہے۔

تقاتلکم الیھود فتسلطون علیھم حتی یقول الحجر یا مسلم ھذا یھودی ورائی فاقتلہ۔ مسلم ص ۳۹۶ ج ۲ (کتاب الفتن واشراط الساعۃ)

موجودہ حالت اور انجام سورۂ بنی اسرائیل کے ابتدائی حصہ میں وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا کے جملہ سے بھی مفہوم ہوتی ہے کہ ان کی بداعمالیاں بڑھیں گی جب وہ انتہا کو پہونچیں گی

تو انتہائی سزا دی جائیگی ۔ مسلم شریف میں اسی صفحہ پر جو روایات دی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب یہودی مارے جائیں گے ۔ انہیں پتھر بھی پناہ نہ دیں گے ۔ صرف ایک درخت جسے غرقد کہا جاتا ہے اس کے پیچھے یا اس کی آڑ میں ہوں گے تو وہ انہیں پناہ دے گا ۔ غرقد کو عوسجہ بھی کہتے ہیں کانٹوں دار درخت ہے فلسطین کے علاقہ میں ہوتا ہے ۔ چھوٹے کو عوسجہ اور بڑے کو غرقد کہتے ہیں ۔ ان کا مارا جانا اور درختوں اور پتھروں کا مخبری کرنا یہ خوارق عادت کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے ۔ اگرچہ ممکن ہے کہ یہ سائنسی ترقی سے ہو لیکن احادیث کا سیاق و سباق اور انداز بیان خرق عادت پر دلالت کر رہا ہے ۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم !

حضرت مہدی کے لشکر کا ایک حصہ بھاگ کھڑا ہوگا ۔ ایک حصہ شہید ہو جائے گا ۔ وہ لوگ افضل الشہداء عند اللہ ہوں گے (مسلم ص ۳۹۲ ج ۲) تیسرا حصہ مع جدید رفقاء فتح یاب ہوتا چلا جائے گا ۔ یہ لشکر قسطنطنیہ فتح کرلے گا ۔ ابھی اس معرکہ سے فارغ ہی ہوئے ہوں گے کہ کوئی شیطان یہ خبر پھیلائے گا کہ دجال تم لوگوں کے اہل و عیال میں پہنچ گیا ہے ۔ یہ لوگ واپس روانہ ہوں گے اور شام کے موجودہ دار الخلافہ دمشق پہنچیں گے تو وہاں دجال نہ ہوگا ۔ یہ خبر جھوٹی ہوگی ۔ لیکن وہیں اتنا پتہ چل جائے گا کہ وہ دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے ۔ ابھی یہ لوگ اسی مقام پر ہوں گے کہ نزول مسیح علیہ السلام ہو جائے گا ۔

(مسلم ص ۳۹۲ ج ۲)

حضرت مہدی علیہ السلام کا دور حکومت بابرکت ہوگا ۔ عدل و انصاف اپنے کمال پر ہوگا ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ان کا دور حکومت سات سال اور بعض روایات کے بطابق نو سال ہوگا ۔ (ابو داؤد کتاب المھدی) ۔ پھر حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا دور شروع ہوگا ۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر مستقل تصانیف موجود ہیں ۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" اسی موضوع پر تالیف فرمائی ہے ۔ یہ مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کی ہے اور میرا مقصد تمام روایات کو جمع کرنا نہیں ہے بلکہ ایک خاکہ پیش کرنا ہے جو احادیث مقدسہ کی روشنی میں سمجھ میں آتا ہے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ظہور یاجوج و ماجوج ہوگا ۔ یہ کثیر التعداد قوم ہوگی ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکے گا ۔ البتہ بچا جا سکے گا کہ انسان محصور ہو جائے ۔ حدیث میں یہی تدبیر بتلائی گئی ہے ۔ (مسلم ص ۴۰۱ - ۴۰۲ ج ۲)

ان کی تعداد کی کثرت ان احادیث میں آئی ہے جن میں جہنم میں داخل کیئے جانے والے لوگوں کا ذکر ہے کہ مسلمان میں سے ایک اور یاجوج ماجوج ایک ہزار ہوں گے۔

(بخاری باب قصۃ یاجوج وماجوج وقول اللہ عزوجل ویسئلونک عن ذی القرنین ص ۴۷۲ ج ۱)

ممکن ہے بخاری شریف وغیرہ کی اس روایت میں اسوقت کے مسلمانوں اور یاجوج و ماجوج کا تناسب مراد ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ وہ کافر ہوں گے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ اولاد یافث بن نوح علیہ السلام سے ہیں۔

ان کے بارے میں تو اتنا ہی تبلانا کافی ہے کہ ان کا وجود مسلّم ہے اور جس وقت ان کے فتنہ کا ظہور ہوگا اس وقت ان کے شر سے بچنے کی تدبیر محصور ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی حالت کے بارے میں مسلم شریف میں ص ۴۰۱ ۔ ۴۰۲ پر روایات موجود ہیں۔ ان کی ہلاکت حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعار سے ہوگی۔ اسی صفحہ پر مسلم شریف میں ہے کہ یہ منکرِ خدا اس وقت وجودِ باری کا مذاق اڑاتے ہوں گے۔ اور یہ بھی ہے کہ ان کی موت (ظاہری اسباب میں) بہت چھوٹے کیڑوں سے ہوگی یرسل علیہم النغف — ص ۴۰۱ مسلم — نغف ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے جو اونٹ اور بکری کی ناک میں پیدا ہو جاتا ہے اس قسم کے جراثیم ان پر چھاجائیں گے۔ ان کی گردن میں تکلیف ہوگی اور سب یک لخت مرجائیں گے۔ لیکن دجّال کے بارے میں بہت روایات ہیں اور اس کا ظہور اور سارا زور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول سے پہلے ہی ہوگا۔ اس لیے آقاءِ نامدار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو ارشادات فرمائے ہیں وہ ملحوظ رکھنے چاہئیں تاکہ اس کے شر سے ہر صاحب ایمان بچ سکے۔

دجّال کا ظہور اصفہان سے ہوگا۔ اس کے ساتھ یہودی ہوں گے۔ مسلم شریف میں ہے:

یتبع الدجال من یهود اصبهان سبعون الفا علیهم الطیالسة (مسلم ۴۰۵ ج ۲)	دجال کے ساتھ اصبہان کے ستر ہزار (یعنی بہت بڑی تعداد میں) یہودی ساتھ ہوں گے۔ ان کے لباس میں ان کی خاص وضع کی لمبی ٹوپی ہوگی۔

اسے لوگوں پر کسی وجہ سے سخت غصّہ آتے گا۔ اس وقت اس کا ظہور ہوگا:

اِنَّ اوّلَ مایبعثهٗ علی النّاسِ غضبٌ یُغضِبُهٗ

(مسلم شریف باب ذکر الدجال ص ۳۹۹ ج ۲)

عبدالرشید عراقی

حافظ ابنِ عبدالبّر قرطبیؒ

(م ۴۶۳ھ)

حافظ ابن عبدالبر جن کی کنیت ابوعمر اور نام یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر ہے، ۲۵ ربیع الآخر ۳۶۸ھ اُندلس کے شہر قرطبہ میں پیدا ہوئے[۱] آپ کے والد علامہ ابومحمد عبداللہ بن محمد (م ۳۸۰ھ) اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ ابن عبدالبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعدازاں حافظ ابن عبدالبر نے جن اساتذہ سے جملہ علوم اسلامیہ میں استفادہ کیا اس کی تفصیل علامہ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) نے وفیات الاعیان میں، حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ میں اور علامہ ابن فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) نے الدیباج المذہب میں بیان کی ہے[۲]

علامہ ابن عبدالبر کے حفظ، ضبط، عدالت وثقاہت اور اتقان پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔ ابن فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

> اندلس کی سرزمین پر وہ سنن ماثورہ کے سب سے بڑے حافظ تھے[۳]

حافظ ابنِ عبدالبر کو گو تمام علوم اسلامیہ میں تبحرِ علمی حاصل تھا، تاہم حدیث اور اس کے متعلقات میں ان کو کمال حاصل تھا۔ حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ:

> ابن عبدالبر مکثر حفاظ میں سے تھے۔ نیز علمِ حدیث و رجال کے ممتاز عالم تھے۔ انہوں نے فنِ حدیث میں ایسی مہارت اور پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ متقدمین علمائے اندلس پر سبقت لے گئے[۴]

حافظ ابن عبدالبر کو اسماء الرجال سے بھی شغف تھا۔ جرح و تعدیل کے بھی امام تھے۔

علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی (م ۱۱۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

"ابن عبدالبر حدیث و رجال کے عالم تھے۔"[۵]

حافظ ابن عبدالبر امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کے فقہی مسلک سے وابستہ تھے۔ تاہم ان کا شمار صاحبِ اختیار فقہا میں ہوتا ہے۔ علم و فضل کی طرح ورع و تدین میں بھی ممتاز تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

"بوصدق و دیانت، حسن عقیدہ اور اتباعِ سنت ان کے حصہ میں آیا، وہ کسی اور کے حصہ میں کم آیا ہے۔"[۶]

حافظ ابن عبدالبر نے شاطبیہ میں ۹۵ سال کی عمر میں ۴۶۳ھ میں انتقال کیا۔[۷]

تصنیفات

حافظ ابن عبدالبر کی تصنیفات میں سے چند شہرۂ آفاق تصانیف درج ذیل ہیں:

التمہید فی المؤطا من المعانی والاسانید: یہ موطا امام مالک کی عظیم الشان اور طویل شرح ہے۔ اسی کی بدولت حافظ ابن عبدالبر کو شہرت حاصل ہوئی۔ علمائے کرام نے اس شرح کی تعریف کی ہے۔

علامہ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"ابن عبدالبر سے پہلے کسی نے ایسی عظیم الشان شرح نہیں لکھی۔"[۸]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

"یہ فقہِ حدیث میں نادرِ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے، مذہب مالکی کے متعلق تنہا یہی کتاب کافی ہے۔"[۹]

مشہور اہلِ حدیث عالم اور محقق مولانا محمد بن یوسف سورتی (م ۱۳۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"شرحِ حدیث میں ابن عبدالبر کی قابل قدر کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے۔"[۱۰]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

"حافظ ابن عبدالبر نے اس کی ترتیب و تصحیح میں موطا کے ۱۲ مستند نسخوں سے مدد لی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی محنت و جانفشانی اور کس قدر اہتمام سے یہ شرح لکھی تھی[۱۰]۔"

کتاب الاستذکار : اس کا پورا نام "الاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ الموطأ من معانی الرأی والآثار" ہے۔ یہ موطا امام مالک کی شرح "التمہید" کا خلاصہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۲۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

یہ موطا کی بہترین اور عمدہ شرحوں میں سے ہے۔ اس کے ابواب کی تنسیق میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور مختصر ہونے کی وجہ سے نہایت مقبول و متعارف ہے[۱۱]۔

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب : حافظ ابن عبدالبر کی یہ بہت مشہور کتاب ہے۔ اسی کی بدولت بھی حافظ ابن عبدالبر کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں ۳۵۸۵ صحابہ کرام کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ علمائے کرام اور اربابِ سیر نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔

علامہ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) نے "اسد الغابہ" کے نام سے کتاب لکھی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) نے 'اسد الغابہ' میں 'الاستیعاب' کو ماخذ قرار دیا ہے۔

صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ مصطفی بن عبداللہ (م ۱۰۶۷ھ) لکھتے ہیں:

"جمع فیہ ما فی الاستیعاب و ذیلہ[۱۳]"

(جو کچھ استیعاب میں ہے اسد الغابہ اس کی جامع بھی ہے اور اس پر ذیل بھی۔)

الاستیعاب کو حافظ ابن عبدالبر نے حروفِ معجم کے مطابق علیحدہ علیحدہ ابواب پر مرتب کیا ہے۔ تاہم تبرک کے خیال میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر

اور جامع تذکرہ لکھا ہے ۔

۱ے ابنِ خلکان ، وفیات الاعیان، ج ۳ ص ۴۱۷

۲ے ابنِ خلکان ۔ وفیات الاعیان، ج ۳ ص ۔ ۴۱۷

ذہبی ، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۶

ابن فرحون مالکی ، الدیباج المذہب، ج ۱ ص ۳۵۷

۳ے ابن فرحون مالکی ، الدیباج المذہب، ج ۱ ص ۳۵۷

۴ے ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۳ ص ۳۲۵

۵ے محمد بن عبد الباقی زرقانی ، شرح زرقانی

۶ے شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی، بستان المحدثین ، ص ۶۹

۷ے ابنِ خلکان ، وفیات الاعیان، ج ۳ ص ۴۲۱

۸ے ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۳ ص ۴۲۱

۹ے شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی ، بستان المحدثین ، ص ۶۹

۱۰ے مولانا محمد بن یوسف سورتی ، مضمون معارف اعظم گڑھ ۔ فروری ۱۹۳۲ء

۱۱ے شاہ ولی اللہ دہلوی ، مصفّٰی شرح موطأ ، ص ۷

۱۲ے شاہ عبد العزیز دہلوی ، بستان المحدثین ، ص ۷۰

۱۳ے حاجی خلیفہ مصطفیٰ ، کشف الظنون ، ج ۱ ص ۲۷۳

قارئینِ کرام

آپ کا خریداری نمبر اور چندہ ختم ہونے کی تاریخ نام و پتہ کے لیبل پر درج ہوتی ہے ۔جس کی وجہ سے فرداً فرداً یاد دہانی کی اگرچہ ضرورت نہیں رہتی ۔تاہم مزید سہولت کے لیے بعض حضرات کو یاد دہانی کے لیے ڈاک کے واپسی کارڈ بھی ارسال کیے جا رہے ہیں جن کا ڈاک خرچ (اندرونِ ملک) ادارہ کے ذمّہ ہے ۔ ازراہِ کرم چندہ ختم ہونے پر پرچہ جاری رکھنے کے بارے میں بروقت مطلع فرمایئے !

اگر آپ میثاق اور حکمتِ قرآن، دونوں کے خریدار ہیں تو ان کے لیے اکٹھی ادائیگی کیجئے ۔ اس سے ادارے کو بھی سہولت ہوگی ۔ شکریہ ۔

من جانب : مینجر سرکولیشن

ڈاکٹر ظفر الاسلام

علمِ قرآن عہدِ سلطنت کے ہندوستان میں

(بشکریہ علوم القرآن، انڈیا)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مذہبی علوم وفنون کی نشر واشاعت اس کی علمی وتمدنی سرگرمیوں کا ایک اہم باب ہے۔ معاصر وغیر معاصر دونوں قسم کے مآخذ میں اس دور میں مذہبی علوم کی ترویج وترقی اور اصحاب علم وفضل کے کارناموں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس دور بالخصوص اس کے پہلے حصہ کی بابت جو عہد سلطنت (۱۲۰۶ء — ۱۵۲۶ء) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس میں فقہ علماء کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا اور تدریسی وتصنیفی سرگرمیاں زیادہ تر اسی میدان میں نمایاں ہوئیں اور مزید یہ کہ سلاطین کی علمی دلچسپی کا مظہر بھی خاص طور پر فقہ ہی کا میدان رہا۔ اس سے فطری طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس عہد میں فقہ کے بالمقابل تفسیر وحدیث کو نظر انداز کیا گیا یا انھیں وہ اہمیت نہ دی گئی جس کے یہ علوم دینیہ مستحق تھے لیکن تاریخی مآخذ اور علماء کے تذکروں میں اس عہد کی تدریسی وتصنیفی سرگرمیوں اور علمی خدمات سے متعلق جو مواد بکھرا پڑا ہے ان کے مطالعہ وتجزیہ سے ایک دوسرا تاثر ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فقہ کے ساتھ ساتھ تفسیر وحدیث کے میدان میں بھی معاصر علماء نے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ ان علوم میں ان کے کارنامے قدر وقیمت کے اعتبار سے دوسرے مذہبی علوم سے کچھ کم نہ تھے[1] یہ اور بات ہے کہ مورخین وتذکرہ نگار فقہی سرگرمیوں اور فقہاء کے کارناموں کو کچھ زیادہ نمایاں انداز میں پیش کرتے ہیں خواہ فقہ کی جانب اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے یا درباری وسیاسی حلقوں میں اس کی مقبولیت کی بنا پر یا کسی اور سبب سے۔ ذیل میں علم قرآن میں عہد سلطنت کے علماء کی دلچسپیوں اور ان کی تدریسی وتصنیفی خدمات کا ایک مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس سے اس عہد میں قرآنی علوم کی نشر واشاعت کا کچھ اندازہ ہوگا اور اس میدان میں علماء وقت کے کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ زیر بحث موضوع کی تفصیلات میں جانے سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ "علم قرآن" ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے یہاں میرا مطالعہ

اس عہد کی درسیات میں قرآنی تعلیم کے مقام، علم تفسیر سے علماء کی رغبت اور فن تفسیر میں تصنیفی و تالیفی کارناموں کے جائزہ تک محدود ہوگا۔

مسلمانوں میں ناظرہ قرآن کی تعلیم کا رواج ہمیشہ رہا ہے اس ضمن میں عہد سلطنت کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتا لیکن اس عہد کا امتیاز یہ تھا کہ فن تجوید یا صحت مخارج کے ساتھ قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ معاصر مآخذ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اس وقت مکاتب و مدارس میں قرآن پڑھانے کے لیے ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جاتا تھا جو فن تجوید یا قرأت میں مہارت رکھتے تھے، یہ ماہرین فن "مقری" یا "قرآن خواں" کے لقب سے معروف ہوتے تھے[۱] عہد سلطنت میں جو علماء خاص طور سے اس فن میں ممتاز تھے اور مقری کے لقب سے مشہور تھے وہ تھے علاء الدین مقری، جمال الدین شاطبی، خواجہ زکی الدین دہلوی اور علاء الدین نیلی، یہ دہلی کے معروف اساتذۂ قرآن میں سے تھے جن سے لوگ کثیر تعداد میں فیضیات ہوئے، معاصر مورخ ضیاء الدین برنی کے بقول یہ فن قرأت پر اس درجہ عبور رکھتے تھے کہ خراسان و عراق میں ان کا ہمسر ملنا مشکل تھا[۲] اس وقت قرآن کی تعلیم میں فن تجوید کو جو اہمیت دی جاتی تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ غلاموں و نومسلموں کے سلسلہ میں بھی اس کا اہتمام کیا جاتا تھا یہاں تک کہ اس فن کے بعض اساتذہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ اپنے اولین استادوں میں شادی مقری کا ذکر کرتے ہیں جن سے انھوں نے بچپن میں بدایوں میں قرآن شریف پڑھا تھا۔ فوائد الفواد (ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ، مرتبہ امیر حسن سنجری) سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ شادی مقری ایک آزاد شدہ غلام تھے اور قرأت سبعہ سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، ان کے آقا خواجگی مقری بھی اس فن کے ماہر تھے[۳] اور یہ عین ممکن ہے کہ ان کے آقا ہی نے انھیں اس فن کی تعلیم دی ہو۔ شیخ نظام الدین ابوالموید کے ارادت مندوں اور عہد بلبنی کے مشہور قاریوں میں قاسم مقری بھی تھے یہ فن تجوید کی تعلیم دینے کے علاوہ اپنے پیر و مرشد کی مجلس میں لوگوں کو اپنی قرأت سے محظوظ کرتے تھے جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے خود شیخ نظام الدین ابوالموید کی ایک مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے قاسم مقری کا تذکرہ کیا ہے[۴] خود شیخ نظام الدین ویاؒ کے مریدوں میں سے شیخ شہاب الدین دہلوی فن تجوید و قرأت میں اپنی مہارت کے لیے مشہور تھے، اور بقول صاحب سیر الاولیاء ان کی آواز "لحن داؤدی" کا سا اثر رکھتی تھی ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر شیخ نے انھیں امامت نماز کی خدمت سپرد کی تھی جو تاحیات جاری رہی[۵] عہد سلطنت

کے آخری حصہ (یعنی پندرہویں صدی عیسوی کے خاتمہ اور سولہویں صدی کی ابتدا) میں جو معلمین قرات گزرے ہیں ان میں محمد بن محمود اور سلیمان بن عفان مندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، تذکروں میں یہ دونوں مقری کے لقب سے منسوب کیے گئے ہیں۔ محمد بن محمود گجرات کے رہنے والے تھے اور وہاں کے ایک ممتاز عالم راجح بن داؤد کے اساتذہ میں شامل تھے۔[۵] جبکہ سلیمان بن عفان سے قرآن پڑھنے والوں میں چشتی صابری سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نام بھی مذکور ہے۔ صاحب اخبار الاخیار کے خیال میں وہ فن تجوید میں یکتائے زمانہ تھے (وی در فن تجوید قرآن یگانہ عصر بود[۵]) ان چند ممتاز ماہرین قرات کے علاوہ تقریباً تمام سلاطین دہلی کے عہد میں اہل علم و فن کے ضمن میں "مقریوں" کا عمومی تذکرہ ملتا ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت سے جو علوم وابستہ ہیں ان میں کتابت قرآن کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اس دور میں جبکہ طباعت کی سہولتیں مہیا نہ تھیں قرآن کی اشاعت کا یہی واحد ذریعہ تھا اس لیے اس فن کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کتابت قرآن ایک نیک مشغلہ تصور کیا جاتا تھا اور خیر و برکت کا ذریعہ بھی اس لیے اس فن کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے پروان چڑھنے کا موقع ملا جو لوگ اسے وجہ معاش کے طور پر اختیار کرتے تھے وہ اس کا معاوضہ کم سے کم حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے شیخ فخرالدین مروزی محمد بن تغلق کے معاصر اور ۱۴ ویں صدی عیسوی کے نامور علماء میں سے تھے ان کا مستقل مشغلہ کتابت قرآن تھا وہ اپنے کتابت کردہ نسخوں کا ہدیہ صرف فی جزو چہار جیتل کے حساب سے وصول کرتے تھے جبکہ اس وقت بازار میں عام شرح کتابت فی جزو شش گانی تھی۔ اگر کوئی برکت کے طور پر ہم جیتل سے زیادہ دینے کی کوشش کرتا تو اسے قبول نہ کرتے۔[۵] سلطان ناصرالدین محمود کی بابت معاصر مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ انیس سال تک اسی مشغلہ میں مصروف رہے اور اسی سے وجہ کفاف حاصل کرتے رہے ان کے بارے میں یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ جب وہ اپنے نسخہ کو بازار میں مدیہ کرنے کے لیے بھیجتے تو خریدار سے کاتب کا نام پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تاکہ سلطان کا نسخہ سمجھ کر کوئی زیادہ قیمت نہ لگائے۔[۵] عہد سلطنت میں قرآن کی کتابت کے لیے نہ صرف عام طرز کتابت اختیار کیا جاتا تھا بلکہ اس میں کتابت کے اعلیٰ نمونے اور فن خطاطی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا تھا اسی دہلی میں جہاں قرآن کا مکمل نسخہ ایک یا دو تنکہ ہدیہ کے عوض دستیاب تھا[۵] بعض کاتبوں کے نسخہ کا ہدیہ پانچ سو تنکہ تک ہوتا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیان کے مطابق جلال الدین مانکپوری (متوفی ۱۳۴۵ء) کی کتابت اس قدر خوبصورت اور معیاری ہوتی تھی کہ ان کے کتابت کردہ قرآن کے نسخے دہلی میں بآسانی پانچ سو تنکہ ہدیہ میں فروخت ہو جاتے تھے[۱۲] یہ عین ممکن ہے کہ ان کے نسخے مطلا و مذہب بھی ہوتے رہے ہوں۔ اُس دور میں کتابت قرآن میں دلچسپی اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اس فن سے واقف نہیں تھے وہ قرآنی نسخوں کی تصحیح میں رغبت رکھتے تھے اور اس کو باعث سعادت تصور کرتے تھے۔

قرآنی تعلیم کے اِن ابتدائی مدارج اور قرآنی علوم کے ان سادہ مظاہر کے علاوہ اس ضمن میں اس عہد کے دوسرے کارناموں اور علماء کی خدمات کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے عہد سلطنت کی درسیات میں تفسیر کا مقام واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت کی درسیات کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس میں فقہ کا عنصر غالب تھا اور یہ کہ مدارس اور علماء کے انفرادی مرکزوں میں فقہ ہی کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ لیکن اس عہد کے نصاب کا تجزیاتی مطالعہ بالخصوص فقہ و تفسیر کے نصاب کا موازنہ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ تفسیر کا نصاب کسی بھی حیثیت سے فقہ سے کمتر نہ تھا۔ اس وقت فقہ کے مروجہ نصاب میں مختصر القدوری، مجمع البحرین[۱۳] اور ہدایہ تین کتابیں شامل تھیں اول الذکر دونوں کتابیں "علم ضروری" کے نصاب کا جز تھیں جس کی تکمیل کے بغیر کوئی اس زمانہ کی اصطلاح میں "دانش مند" کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا[۱۴] ہدایہ علم ضروری سے آگے بڑھ کر "فضل" یا "منتہیانہ" درجہ کے نصاب میں شامل تھی[۱۵] اسی کے بالمقابل تفسیر کی درسیات میں بھی تین کتابیں۔ تفسیر مدارک، بیضاوی و کشاف۔ رائج تھیں ان تینوں میں کشاف کو خصوصی اہمیت حاصل تھی[۱۶] اس کی وجہ یہ تھی کہ آیات کریمہ کی ترجمانی و تشریح کے ضمن میں الفاظ کی لغوی تحقیق، وجوہ اعراب اور علم بیان و معانی کے مسائل سے جس انداز سے اس میں بحث کی گئی ہے وہ دوسری تفسیروں میں نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ لغوی و لسانیاتی تحقیق کے ساتھ فہم قرآن کا مادہ پیدا کرنے کے لیے یہ تفسیر بہت مفید سمجھی جاتی ہے گرچہ صاحب تفسیر کے عقائد و نظریات کی وجہ سے یہ ہمیشہ محل نظر رہی ہے۔ عہد زیر بحث میں اس کی مقبولیت کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد ممتاز علماء (مثلاً فرید الدین شافعی، نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی، شمس الدین یحییٰ اودھی، سید محمد کرمانی، قاضی عبدالمقتدر، قاضی شہاب الدین دولت آبادی وغیرہم) کے تذکرے

میں درسی کتابوں کے ضمن میں خصوصیت سے کشاف کے پڑھنے پڑھانے کا حوالہ ملتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض معاصر صوفی لٹریچر سے جہاں اس تفسیر کی مذمت ظاہر ہوتی ہے وہیں صوفیوں کے حلقوں میں اس کے پڑھنے پڑھانے اور مطالعہ کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے[۳۸]۔ خود شیخ نظام الدین اولیا اور ان کے مریدوں کے ضمن میں اس کے متعدد تذکرے مآخذ میں موجود ہیں، اس تفسیر سے شیخ کی دلچسپی اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے ایک مرید رکن الدین چغر نے جو خوشخط کے لیے مشہور تھے درسی کتابوں میں خاص طور سے کشاف کا قلمی نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا[۳۹]۔ بہر حال اپنی فنی خصوصیات کی وجہ سے تفسیری درسیات میں کشاف کی مقبولیت پورے عہد سلطنت میں باقی رہی اور علما کی اس سے دلچسپی برقرار رہی اور قابل غور امر یہ ہے کہ اسے عمومی درسیات سے اس وقت خارج کیا گیا جب کہ مغل دور کے آخر میں درسی نصاب ترمیمی مراحل سے گذرا[۴۰]۔ البتہ کشاف سے مناسبت قائم رکھنے کے لیے تفسیر بیضاوی (جو اصلاً تفسیر کشاف و رازی سے مستفاد ہے) کے منتخب اجزا باقی رکھے گئے[۴۱]۔ ان تفصیلات سے بخوبی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد سلطنت میں تفسیری نصاب دیگر دینی علوم سے کمتر نہ تھا اور اگر تفسیری نصاب کا اختصار یا ہلکا پن تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ حقیقت نگاہوں سے نہیں اوجھل ہونی چاہیے کہ اس وقت کی درسیات زیادہ تر تمرینی نوعیت کی تھیں اور ان سے مقصود طلبہ میں سوچنے و سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اور مطالعہ کی استعداد بڑھانا تھا تاکہ وہ از خود مختلف مضامین کی کتابیں پڑھنے اور ان کے مطالب گرفت کرنے کے لائق ہو جائیں اسی نقطۂ نظر سے ہر فن کی منتخب کتابیں نصاب میں رکھی جاتی تھیں جو عموماً مجمل اور لغوی و فنی اعتبار سے پیچیدہ ہوتی تھیں، غور و فکر کا عادی بنانے اور قوت فہم تیز کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ہر مضمون کے لیے لمبا چوڑا نصاب متعین کیا جائے یا درسیات میں کتابوں کی لمبی فہرست شامل کی جائے۔

عہد سلطنت میں نہ صرف یہ کہ تشریح و ترجمانی کے ساتھ قرآن کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اور تفسیر درسیات کا ایک لازمی جز تھا بلکہ اس فن میں گہری دلچسپی اور مہارت تامہ رکھنے والے علماء و فضلا بھی اس وقت پائے جاتے تھے۔ انھوں نے خواہ مدارس میں مسند تدریس کو زینت بخشا یا انفرادی مجالس کے ذریعہ علم کی روشنی پھیلائی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کے ذریعہ قرآن فہمی کا ذوق پروان چڑھا اور فن تفسیر کو رواج ملا اور اہم بات یہ ہے کہ ان میں

ہندوستانی نژاد علما بھی شامل تھے جو اُسی تعلیمی نظام کے پروردہ اور مروجہ درسیات سے فیضیافتہ تھے جس سے علم تفسیر وحدیث سے پہلوتہی منسوب کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلم عہد کے ابتدائی دور کے علمائے تفسیر میں سید محمد اسمٰعیل بخاری (متوفی ۱۰۵۰ء) کا نام سرفہرست آتا ہے جو محمود غزنوی (۹۹۸ - ۱۰۳۰ء) کے معاصرین میں سے تھے یہ اصلاً بخارا کے رہنے والے تھے جیسا کہ ان کی نسبت سے واضح ہے اور ۱۱ویں صدی کے شروع (۱۰۰۴ء) میں لاہور میں سکونت پذیر ہوئے ہمارے مآخذ کا عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ وہ علم تفسیر وحدیث دونوں میں خصوصی دستگاہ رکھتے تھے اور لاہور میں پہلے پہل ان علوم کی اشاعت انھیں کی مرہون منت تھی[۲۱] سلطان شہاب الدین غوری (۱۱۷۵-۱۲۰۶ء) کے معاصرین میں سید مرتضیٰ کوفی (متوفی ۱۱۹۴ء) تفسیر وحدیث کے مشہور عالم گزرے ہیں۔ ان کی علمی صلاحیت بالخصوص دینی علوم میں مہارت سلطان کی توجہ کا باعث بنی اور وہ مقربین بارگاہ میں شامل کیے گئے۔ ان میں سپاہیانہ اوصاف بھی بدرجہ اتم پائے جاتے تھے اس لیے سلطان نے ان کے علم وفضل سے استفادہ کے علاوہ اپنے فاتحانہ اقدامات میں بھی ان کی صلاحیتوں کو استعمال کیا[۲۲]۔ بیرون ہند سے آنے والے علما میں جو علم تفسیر میں اپنا امتیاز رکھتے تھے مولانا نجم الدین دمشقی بھی شامل ہیں۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) کے زمانہ کے مشہور علما میں سے تھے معاصر مورخ ضیاء الدین برنی کے بقول یہ صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کے شاگرد تھے اور سلطان کو ان سے خاص عقیدت تھی[۲۳]۔ ایک دوسرے مورخ نورالحق دہلوی نے انھیں امام رازی کے "شاگرد خاص" کی حیثیت سے ذکر کیا ہے[۲۴]۔ علم تفسیر میں نجم الدین دمشقی کی دلچسپی اور سلطان کا ان سے تعلق یقیناً اس علم کی اشاعت کا سبب بنا ہوگا۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غیاث الدین بلبن نے اپنے بیٹوں (شہزادہ محمد ومحمود) کو مختلف موقعوں پر جو نصیحتیں کی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ انھیں اپنے دارالسلطنت کو علما ومشائخ، مفسرین ومحدثین اور دوسرے اہل علم وہنر سے معمور رکھنا چاہیے[۲۵]۔

سلاطین دہلی میں علاء الدین خلجی کا زمانہ (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء) علمی وتمدنی ترقی کے لیے معروف ہے۔ ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق تفسیر فقہ واصول فقہ اصول دین ومعقولات نحو ولغت اور کلام ومنطق جیسے مختلف علوم میں یدطولیٰ رکھنے والے علما اس وقت زینت آرائے دارالسلطنت تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے فن میں یگانہ ومنفرد تھا یہاں تک کہ معاصر اسلامی دنیا میں ان کا ہمسر ملنا مشکل تھا۔ خود برنی کے اپنے الفاظ میں "ودر تمامی

عصر علائی در دار الملک دہلی علمای بودند کہ انچناں استادان کہ ہر یکی علامہ وقت و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و ری و روم و در ربع مسکون نباشند[۲۶]

قرآن کی تشریح و ترجمانی اور اس کی تفسیر میں عہد علائی کے جن علماء کو خصوصی ملکہ حاصل تھا ان کے ضمن میں مذکور مورخ نے مولانا ضیاء الدین سُنامی اور مولانا شہاب الدین خلیلی کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر اپنے تبحر علمی اور شریعت کی سخت پابندی کے لیے مشہور تھے ہفتہ میں ایک روز ان کی خصوصی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں ہزاروں لوگ ان کے وعظ و نصیحت سے مستفید ہونے کے لیے شریک ہوتے تھے۔ اس مجلس میں وہ خاص طور سے قرآنی آیات پیش کرتے اور ان کے معانی و مطالب کی وضاحت فرماتے[۲۷] ان کی کتاب "نصاب الاحتساب" میں بھی قرآنی آیات و احادیث نبوی کے جا بجا حوالے ملتے ہیں۔ صاحب نزہۃ الخواطر فن تفسیر میں ان کی مہارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "للسنامی الید البیضا فی تفسیر القرآن وکشف حقائقہ"[۲۸] مولانا شہاب الدین خلیلی بھی اس عہد کے مشہور مذکرین (واعظین) میں سے تھے ان کے درس کا بیشتر حصہ قرآنی آیات کی وضاحت پر مشتمل ہوتا تھا جو یقیناً فہم قرآنی میں ادراک اور قرآنی تعلیمات میں ان کی دلچسپی کا مظہر تھا[۲۹] اسی دور کے ایک دوسرے عالم فرید الدین شافعی اودھی تھے۔ عربی زبان و ادب اور علوم دینیہ بالخصوص علم تفسیر میں اپنی مہارت کے لیے ممتاز تھے، اودھ کے شیخ الاسلام تھے اور اسی کے ساتھ تعلیمی و تدریسی مصروفیات بھی جاری رہتی تھیں، مروجہ کتب میں خاص طور پر وہ کشاف کے درس کے لیے مشہور تھے ان کے تفسیری درس سے اودھ کے متعدد معاصر علماء مستفید ہوئے[۳۰] عہد علائی کے علماء میں قاضی محی الدین کاشانی (متوفی ۱۳۱۹ء) بھی علوم تفسیر، حدیث و فقہ میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے، اپنے علم و فضل اور تدریسی خصوصیات کی وجہ سے "استاد شہر دہلی" کے لقب سے مشہور تھے، شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں سے تھے اور ان کی مجلس میں احادیث کی تشریح فرماتے تھے اور اس ضمن میں قرآنی آیات سے مثالیں بھی پیش کرتے تھے[۳۱]

خلجی خاندان کے مثل تغلق سلاطین کا زمانہ حکومت بھی علمی سرگرمیوں کے لیے معروف ہے۔ ان سلاطین میں محمد تغلق (۱۳۲۴-۱۳۵۱ء) اور فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے علوم و فنون کی اشاعت میں بڑی دلچسپی لی اور خاص طور سے مذہبی علوم ان کی توجہ کا مرکز بنے[۳۲] یہ عہد بھی علم تفسیر کی ترویج اور علماء تفسیر کی تعداد کے اعتبار سے دور سابق سے

کمتر نہ تھا اس عہد کے اساتذہ تفسیر میں خصوصیت سے مولانا شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی (متوفی ۱۳۴۶ء) شیخ علاء الدین نیلی اودھی (متوفی ۱۳۶۱ء) شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ اودھی (متوفی ۱۳۵۶ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر دونوں ماہر کشاف مولانا فرید الدین شافعی کی علمی مجلس کے فیض یافتہ اور ان کے ممتاز شرکاء درس میں سے تھے۔ ان دونوں نے تحصیل علم کے بعد دہلی میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور تفسیر کے بہترین استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے[۳۲] گرچہ اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ شیخ نصیر الدین محمود نے مولانا فرید الدین سے کشاف کی تعلیم حاصل کی لیکن یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ ان کے اساتذہ میں مولانا شمس الدین محمود بن یحییٰ (تلمیذ مولانا فرید الدین) بھی شامل تھے۔ شیخ نصیر الدین کا محبوب مشغلہ درس و تدریس تھا اور مذکورہ بالا علماء اودھ کے مثل ان کی تدریسی خدمات بھی دہلی میں جاری ہوئیں۔ ان سے کشاف پڑھنے والوں میں اس عہد کے مشہور عالم قاضی عبد المقتدر دہلوی بھی تھے جن سے صاحب تفسیر بحر مواج قاضی شہاب الدین دولت آبادی جیسے متبحر علماء نے استفادہ کیا[۳۳]۔ شیخ نصیر الدین محمود کے خلفاء اور محمد تغلق کے معاصرین میں شیخ کمال الدین علامہ دہلوی (متوفی ۱۳۵۶ء) علم تفسیر و حدیث میں خصوصی دستگاہ رکھتے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے خیال میں وہ تفسیر و حدیث و فقہ میں غیر معمولی تبحر کی وجہ سے "علامہ" کے لقب سے مشہور تھے صاحب تذکرہ علماء ہند کے الفاظ میں "وچونکہ وی بحدیث وتفسیر وفقہ واصول یگانۂ روزگار بود ویرا علامی گفتند"[۳۴]۔ شیخ یوسف دہلوی (متوفی ۱۳۷۳ء) بھی جن کی علمی خدمات محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق دونوں کے عہد سے تعلق رکھتی تھیں، علوم دینیہ (تفسیر، حدیث و فقہ) کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے حدائق الحنفیہ کے مصنف کے بقول وہ "عالم علوم ربانی اور ماہر فقہ و حدیث و تفسیر تھے"[۳۵]۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں جو دینی علوم کی نشر و اشاعت کے لیے پورے عہد سلطنت میں سب سے زیادہ مشہور ہے مولانا جلال الدین رومی قرآنی علوم سے پوری طرح بہرہ ور تھے اسی خصوصیت کی بنا پر سلطان نے انھیں دار السلطنت کے عظیم الشان مدرسہ، مدرسۂ فیروز شاہی میں تدریس کی خدمت تفویض کی جس میں وہ تا حیات مصروف رہے اور علم تفسیر و حدیث و فقہ کی اشاعت کرتے رہے۔ ان کی تدریسی خدمات سے بہت سے لوگ فیضیاب ہوئے جن میں شیخ یوسف بن جمال ملتانی (متوفی ۱۳۸۸ء) بھی شامل تھے معاصر مورخ برنی ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ومولانا جلال الدین رومی کہ بس استادی متفنن است دایماً در منصب افادت سبق

علوم دینی می گویند و متعلمان را ہموارہ تعلیم می کنند و تفسیر و حدیث و فقہ می خوانند[۵۴] عہد فیروز شاہی میں قرآنی علوم کی ترویج و ترقی اس سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ بعض وزراء (مثلاً تاتار خاں) نے بھی علم تفسیر میں دلچسپی لی اور علماء کی ایک منتخب مجلس کی مدد سے تفسیر کا ایسا ضخیم مجموعہ (تفسیر تاتار خانی) مرتب کرایا جو ہر آیت کی تشریح سے متعلق گزشتہ تمام مفسرین کے خیالات اور ان کی اختلافی رایوں کی وضاحت پر مشتمل تھا[۵۵] ظاہر ہے کہ ایسی تفسیر کی ترتیب عمل میں نہیں آسکتی تھی اگر ماہرین قرآنیات کی ایک جماعت اس وقت موجود نہ ہوتی۔

حواشی و مراجع

سلہ عہد وسطی کے ہندوستان میں علم حدیث کی ترقی کے لیے دیکھئے سید سلیمان ندویؒ کا مقالہ "ہندوستان میں علم حدیث" مقالات سلیمان، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء جلد دوم صدا - ۵۵ اور ڈاکٹر اسحاق احمد، انڈیا کانٹری بیوشن ٹو دی اسٹڈی آف حدیث لٹریچر، اردو ترجمہ بعنوان "علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ"، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۳ء

سلہ "قرآن خواں" کا لقب عہد سلطنت کی بعض سیاسی شخصیتوں سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ فخر مدبر نے سلطان قطب الدین ایبک کے لیے یہی لقب استعمال کیا ہے اور اس کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ قرآن شریف اچھی طرح پڑھ لیتا تھا (تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، تحقیق و تصحیح سر ڈینی سن راس، لندن ۱۹۲۷ء، صا۲) تغلق دور کے ایک اہم عہدہ دار ملک قبول جو فیروز شاہ کے زمانہ میں سامانہ و بدایوں کے گورنر بھی رہ چکے تھے "قرآن خواں" کے لقب سے مشہور تھے۔ اسی نسبت سے ان کی ایما سے ترتیب دیا گیا فتاوی کا ایک مجموعہ "فتاوای قران خوانی" کے نام سے معروف ہے گرچہ اب اسکالرس اور فہرست نگار بالعموم اسے "فتاوای قراخانی" کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ (یحیی سرہندی، تاریخ مبارک شاہی کلکتہ، سلہ۱۹۳۱ء، صہ۱۲۷، ۱۳۴ - ۱۳۵، برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء صہ۵۲۷، شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۰ء، صہ۴۵۴ - ۴۵۵، فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد دوم، صہ۲۹۶، فہرست مخطوطات فارسیہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ، ۱۹۲۴ء، صہ۴۹۸ - ۴۹۹، فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس، جلد دوم، صہ۳۰۶۹ -

سلہ برنی، صہ۳۵۵، ان ماہرین قرأت کے حالات کے لیے ملاحظہ کریں، سید محمد کرمانی، سیر الاولیا، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء، صہ۲۸۵ - ۲۸۶، سید عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۹۳۱ء، الجزء الثانی، صہ۴۷، ۸۵ -

سلہ فوائد الفواد، تصحیح محمد لطیف، لاہور، ۱۹۶۶ء، صہ۲۶۲ -

۵۵ فوائد الفواد، ص۲۲۲ ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی ، اخبار الاخیار، مطبع محمدی، دہلی، ۱۲۸۳ء، ص۹۴ ۔

۵۶ سیر الاولیاء، ص۳۰۰-۳۰۱، محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، مخطوط مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، ۲۲/۵، ص۴۶ ۔ نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۵۹ ۔

۵۷ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۳۲ھ، ص۶۲، نزہۃ الخواطر، الجزء الرابع، ص۱۱۱ ۔

۵۸ اخبار الاخیار، ص۲۱۲ ۔

۵۹ سیر الاولیاء، ص۳۰۸، اخبار الاخیار، ص۹۰-۹۱، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۰۶ ۔

۶۰ برنی، ص۲۶، عزالدین عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص۱۵۶، ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، نولکشور، ۱۲۸۱ھ جلد اول، ص۳۰۷

۶۱ فوائد الفواد، ص۱۸۹

۶۲ اخبار الاخیار، ص۹۰-۹۱، تذکرہ علمائے ہند، ص۱۴، نزہۃ الخواطر، الجزء الثالث ص۲۹ ۔ جلال الدین کی بابت یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ وہ ہمیشہ باوضو کتابت قرآن کیا کرتے تھے ۔

۶۳ مجمع البحرین احمد بن علی معروف بابن الساعاتی (متوفی ۶۹۴ھ) کی تالیف جسے قدوری وکنز کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا بعد میں مغل دور میں جب نصاب میں ترمیم کی گئی تو اس کی جگہ شرح وقایہ کو نصاب میں شامل کیا گیا (عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۹ء، جلد سوم، ص۸۴ ۔

۶۴ سیر الاولیاء، ص۲۹۹، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۷۷ ۔

۶۵ سیر الاولیاء، ص۲۱۷، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۱۳ ۔

۶۶ سیر الاولیاء، ص۲۱۷، اخبار الاخیار، ص۹۴-۹۵، تذکرہ علمائے ہند، ص۱۴۰، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۷۱

۶۷ فوائد الفواد، ص۱۸۶-۱۸۸ ۔

۶۸ سیر الاولیاء، ص۳۲۷ ۔

۶۹ بعض جدید اسکالرس نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ نصاب میں ترمیم کے نتیجہ میں جب معقولات کی کتابوں میں اضافہ ہو گیا تو ان کتابوں کی ضرورت باقی نہ رہی جن کی حیثیت تمرینی تھی یا جن میں متکلمانہ و فلسفیانہ مباحث کی کثرت تھی جیسے اصول فقہ میں "بزدوی" اور تفسیر میں "کشاف" تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، سید مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۴۴ء، ص۳۰۹، ۲۴۵-۲۴۶

۷۰ عہد وسطی کی درسیات اور ان میں عہد بعہد ترمیمات کے لیے دیکھئے سید عبدالحئی، اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص۹-۱۸، ۲۳-۳۰

۲۱ھ فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، نولکشور ایڈیشن ص۱۹۴، تذکرہ علماء ہند، ص۱۷۹، نیز دیکھئے مقالات سید سلیمان محولہ بالا جلد دوم، ص۸۱

۲۲ھ دیکھئے محدثین جونپور، معارف، اعظم گڑھ، جلد نمبر ۲۵، شمارہ نمبر ۵ ص۳۴۶ - ۳۴۷

۲۳ھ تاریخ فیروز شاہی، ص۳۶۴، ۱۱۱، تذکرہ علماء ہند، ص۲۸۸

۲۴ھ زبدۃ التواریخ، روٹوگراف ۱۸۱ (مخطوطہ برٹش میوزیم) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ - ورق ۱۷ اب۔

۲۵ھ برنی، ص۱۰۳۔

۲۶ھ ایضاً ص۲۵۳ - ۲۵۴۔

۲۷ھ ایضاً، ص۳۵۶، نیز دیکھئے اخبار الاخیار، ص۱۰۵ - ۱۰۶، تذکرہ علماء ہند، ص۹۷ - ۹۸

۲۸ھ نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی ص۹۷، ۹۸

۲۹ھ برنی، ص۳۵۶، تذکرہ علماء ہند، ص۲۶۶

۳۰ھ سیر الاولیاء، ص۲۳۳، اخبار الاخیار، ص۹۴ - ۹۵، تذکرہ علماء ہند، ص۸۶ - ۸۷، ۱۴۰، نزہۃ الخواطر الجزء الثانی ص۰۱

۳۱ھ سیر الاولیاء ص۱۱۱ - ۱۱۲، ۳۰۴ - ۳۰۶، اخبار الاخیار، ص۹۵، گلزار ابرار، ص۴۳ - ۴۴، ۵۵، حدائق الحنفیہ ص۲۷۶، تذکرہ علماء ہند، ص۲۲۱ - ۲۲۲، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۶۳ - ۱۶۴۔

۳۲ھ برنی، ص۵۵۸ - ۵۶۰، سیرت فیروز شاہی، قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار، ۱۱۱، ص۱۴۷

۳۳ھ سیر الاولیاء، ص۲۳۳، ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۹، اخبار الاخیار، ۹۱، ۹۴ - ۹۵، غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان معہد الدراسات الاسلامیہ، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص۲۷ - ۲۳، تذکرہ علماء ہند، ص۸۶ - ۸۷، ۱۴۰، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۸۰ - ۸۱، ص۱۴۷

۳۴ھ سیر الاولیاء، ص۲۴۶ - ۲۵۲، اخبار الاخیار، ص۷۸ - ۸۲، ۱۴۶ - ۱۴۷، گلزار ابرار، ص۵۸ - ۵۹، تذکرہ علماء ہند ص۱۳۳، ۲۲۸، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۵۸ - ۱۶۰، ایضاً، الجزء الثالث، ص۱۷

۳۵ھ تذکرہ علماء ہند، ص۱۷۳، حدائق الحنفیہ، ص۲۸۸، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۱۶

۳۶ھ حدائق الحنفیہ، ص۲۹۴، نیز دیکھئے تذکرہ علماء ہند، ص۲۵۶، نزہۃ الخواطر، الجزء الثانی، ص۱۷۹

۳۷ھ تاریخ فیروز شاہی، ص۵۶۵، ان کے حالات کے لیے دیکھئے تذکرہ علماء ہند، ص۱۴، ۲۵۶، نزہۃ الخواطر الجزء الثانی، ص۲۲، ۱۷۸

۳۸ھ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، محولہ بالا، ص۳۹۲

حکمت اقبال ۲۶
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور رحمۃ للعلمین ﷺ (۳)

نظریاتی ارتقاء کی رکاوٹیں

حیاتیاتی سطح ارتقاء پر زندگی کی جو خصوصیات ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں ہم ان کی بنا پر حیاتیاتی تقلیبات کی نہایت ہی معقول وجوہات قائم کر سکتے ہیں۔ ان وجوہات کی روشنی میں یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو نظریاتی مرحلۂ ارتقاء میں بھی اپنی منزل مقصود کی طرف آگے بڑھنے میں اپنی پیدا کی ہوئی جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سے ایک رکاوٹ پھر ایک قسم کے قانون وراثت سے پیدا ہوئی جس کو نظریاتی وراثت کا قانون کہنا چاہیئے۔ اس قانون کے عمل سے ایک ہی نظریاتی جماعت کے افراد ہمیشہ اپنے آباء و اجداد کے نظریۂ حیات کو اختیار کرتے ہیں، خواہ وہ نظریۂ حیات اچھا ہو یا بُرا، زیبا ہو یا زشت اور اس سے سرِمو انحراف نہیں کرتے۔ اس قانون سے قدرت کی غرض یہ تھی کہ جب بھی نبی کامل یا رحمۃ للعلمین ﷺ ظہور پذیر ہوں اور ان کی روحانی اولاد بڑھنے اور ترقی پانے لگے تو وہ اپنے نبیؐ کے کامل نظریۂ حیات کو، جو کہ ظاہر ہے کہ لاکھوں برس کے نظریاتی ارتقاء کا نہایت ہی قیمتی ثمر قرار پا چکا ہوگا، نسلاً بعد نسلٍ ایک اندرونی نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے ہمیشہ اسی اصلی صورت میں قائم رکھ سکیں جس میں ان کے نبی نے اسے چھوڑا ہو۔ تاکہ نبیؐ کامل کی امت اپنی پائدار نظریاتی تکمیل اور برتری کی وجہ سے نہ صرف قائم رہے اور دنیا میں پھیل جائے بلکہ اپنے قائم رہنے اور پھیل جانے کی وجہ سے نوعِ انسانی کو کسی ناقابل عبور مزاحمت کے بغیر حسن و کمال کی انتہا تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ لیکن ہر نبی کی صورت میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ اس کی قوم ایک عرصہ تک تو اپنی عملی زندگی کو نہایت سختی کے ساتھ اس کے عطا کیے ہوئے نظریۂ حیات کے تابع رکھتی تھی۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آجاتا تھا جب اس کے تمدنی حالات ترقی کر کے ان کی قدرتی عملی زندگی کے بعض ایسے اہم نئے

گوشوں کو بے نقاب کر دیتے تھے جن کے متعلق نبی کی عملی زندگی کی مثال میں یہ رہنمائی موجود نہ تھی کہ ان پر خدا کے تصور کا اطلاق کس طرح سے ہو۔ لہٰذا اس مرحلہ پر پہنچ کر نظریاتی ارتقاء کو جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس نبی کی امت میں سے کم از کم ایک فرد ایسا پیدا ہو جو پہلے نبی ہی کی طرح خدا کی وحی سے علم اور اطمینان پاکر اور نظریاتی وراثت کے قانون کو برطرف رکھ کر اپنی عملی زندگی کی مثال کی صورت میں ایک نیا نبوتی نظریۂ حیات پیش کرے جو خدا کے تصور کو قوم کے نئے حالات پر چسپاں کرے اور خدا کی وحی کے نام پر ہی دوسروں کو دعوت دے کہ وہ اس نظریہ کو قبول کریں۔ چنانچہ ایسا ہوتا رہا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک نبوتی نظریۂ حیات کے بعد دوسرا بہتر اور بلند تر نبوتی نظریۂ حیات پیدا نہ ہو سکتا اور ایک ایسے نبی کے ظہور کی نوبت نہ آسکتی جو خدائے واحد کے عقیدہ کو اپنی نظریاتی تعلیم اور عملی زندگی کی مثال سے انسان کی ترقی یافتہ قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں کر کے ایک کامل نبی قرار پائے۔

نظریاتی تقلیبات کا سلسلہ

لہٰذا نظریاتی مرحلۂ ارتقاء میں زندگی کی خصوصیات کی وجہ سے ایسا ہوتا رہا کہ ہر بار جب زندگی نے محسوس کیا کہ اس کی منزلِ مقصود یعنی رحمۃ للعلمین کے ظہور کی طرف اس کی ارتقائی حرکت بعض رکاوٹوں کی وجہ سے حد سے زیادہ سست ہو رہی ہے تو اس نے ایک غیر معمولی کوشش کی اور یکایک گویا ایک جست سے اپنی رکاوٹوں کو عبور کر گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا نبی معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہو گیا جس کا نظریۂ حیات زندگی کے نئے حالات پر بھی حاوی تھا اور جس کی روحانی اولاد سے ایک نئی امت پیدا ہوئی۔ اس طرح سے ایک نبوتی نظریۂ حیات سے دوسرا بعض وجوہ سے بہتر اور بلند تر نظریۂ حیات پیدا ہوتا رہا۔ نظریاتی تقلیبات کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک ان کا مقصد حاصل نہیں ہوا یعنی جب تک کہ نبی کامل کا ظہور نہیں ہوا۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو نظریاتی تقلیبات کے ظہور کا سبب زائل ہو جانے کی وجہ سے ان کا سلسلہ خود بخود اسی طرح سے منقطع ہو گیا جس طرح سے حیاتیاتی تقلیبات کا سلسلہ ان کا مقصد حاصل ہونے اور ان کے ظہور کا سبب زائل ہونے کے بعد یعنی ایک مکمل جسمانی یا انسان کے ظہور کے بعد خود بخود منقطع ہو گیا تھا۔ لہٰذا کامل نبی خاتم النبیین

یا آخری نبی بھی قرار پائے۔ یہی کامل اور آخری نبی جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو قرآن حکیم نے رحمۃ للعلمین کا لقب دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی عملی زندگی کی مثال میں خدا کا عقیدہ انسان کی قدرتی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں ہو گیا ہے اور نبوتی راہنمائی کی تکمیل ہو گئی ہے اور نوعِ بشر جو حاصلِ عالم ہے تا قیامت کسی اور نبی کی قیادت سے بے نیاز ہو گئی ہے اور اب صرف ان ہی کے ذریعہ سے اپنے حسن و کمال کی انتہا تک پہنچ کر خدا کی انتہائی رحمتوں سے ہمکنار ہو گی۔

ارتقائے نبوت کے ان حقائق کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتا ہے کہ خودی سو انبیاء کو پیدا کر کے ختم کرنے کے بعد ہی ایک کامل نبی پیدا کرتی ہے۔

شعلہ ہائے اُو صد ابراہیمؑ سوخت تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

رحمۃ للعلمینؐ کی تعلیم کے امتیازات

ہر گزشتہ نبی کی تعلیم (اور ایک نبی کی تعلیم دراصل کلیتہً اس کی اپنی عملی زندگی کی مثال کے اندر ہوتی ہے اور اس کے نظریات یا اقوال میں نہیں ہوتی) صحیح تصورِ حقیقت یعنی خدا کے تصور پر مبنی تھی لیکن رحمۃ للعلمین کے علاوہ کسی نبی کو ایسے تمدنی حالات پیش نہیں آئے کہ وہ اپنی زندگی کی مثال سے یہ بتائے کہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں خدا کے عقیدہ کے لوازمات اور تقاضے کیا ہیں اور کس طرح سے خدا کا عقیدہ ان شعبوں پر چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے ہر نبی کو جن سماجی حالات میں رہنا یا جن واقعات کا سامنا کرنا پڑا وہ اس قسم کے تھے کہ ان کے پیشِ نظر ایک نبی ہونے کی وجہ سے اسے جو معرفتِ حق تعالیٰ عطا ہوئی اس کا بہت تھوڑا حصّہ اس کی عملی زندگی کے نمونہ میں اپنا اظہار پا سکا۔ ہر نبی اپنی عملی زندگی کی مثال کی روشنی سے انسان کی قدرتی عملی زندگی کے صرف ان پہلوؤں کا رشتہ خدا کے عقیدہ سے واضح کر سکتا تھا جو اس کی قوم کے تمدنی اور اخلاقی حالات کی بنا پر اس کی توجہ چاہتے تھے اور وہ مجبور تھا کہ انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا جو ابھی اس کی قوم کے حالات میں رونما نہیں ہوتے تھے اور جن کے بارہ میں ان کو فی الحال خدا کی راہ نمائی کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح سے ہر گزشتہ نبی خدا کے تصور کو انسان کی قدرتی عملی زندگی کے

صرف ایک حصّہ پر ہی چسپاں کر سکا۔ یہی سبب ہے کہ ماضی کے ہر نبی کے نظریۂ حیات نے صرف اُس کی قوم کو یا اس کے عہد کو ہی مستفید کیا اور ان کے بعد زیادہ دیر تک اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکا بلکہ ان کتابوں کے اندر بھی جو ان انبیاء پر نازل ہوئی تھیں کچھ عرصہ کے بعد ایسا مواد داخل کر دیا گیا جو نہ تو خدا کا قول تھا نہ نبی کا۔ ان نظریات کی وقتی یا جزوی حیثیّت نہ صرف ان کی سرشت سے آشکار ہے بلکہ خود ان کے بانیوں کے ارشادات سے بھی واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ ایک ناتمام نبوّتی نظریۂ حیات ایک مستقل اور عالمگیر نظریۂ حیات نہیں بن سکتا اور نہ ہی اس غرض کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی خاص قوم کو ارتقائے انسانیت کے ایک خاص مرحلہ کے اندر کام دے سکے اور آئندہ کے نظریاتی ارتقاء کی ایک منزل قرار پائے۔ اس کا غیر مکمل ہونا اس کے لیے ناممکن بنا دیتا ہے کہ ایک محدود عرصہ کے بعد اپنی زندگی قائم رکھ سکے۔

نبی کامل رحمۃٌ للعٰلمین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ بات درست نہیں، کیونکہ ان کو فرستادۂ حق کی حیثیّت سے جن اخلاقی، ثقافتی، اقتصادی، سماجی، قانونی، سیاسی، جنگی اور جغرافیائی حالات کا سامنا کرنا پڑا، اُن کی وجہ سے وہ اپنی عملی زندگی کی مثال سے یہ بات واضح کر سکے کہ فرد اور جماعت کی قدرتی عملی زندگی کے اہم شعبوں پر خدا کا عقیدہ کیونکر چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص رحمۃٌ للعٰلمین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی نبی کی عملی زندگی کے نمونہ میں ہمیں انسانی زندگی کے جنگی، قانونی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی پہلوؤں کے متعلق (جو یقیناً انسان کی زندگی کے نہایت ہی اہم پہلو ہیں) ضروری راہنمائی نہیں ملتی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے متاہل زندگی بسر کی، اپنے ساتھیوں کو تیار کیا کہ ان لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کریں جو ان کے پیغام کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے، خدا پرستوں کی ایک ریاست قائم کی، اس کا انتظام کیا اور فوجی کارروائیاں کر کے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی۔ اس کے اندرونی اور بیرونی مسائل کو حل کیا اور اس کے سیاسی، قانونی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی، اطلاعاتی اور تبلیغی نظامات قائم کیے اور اس کی ایک خارجہ پالیسی وضع کی۔ ہر نظریاتی جماعت کو اپنے نصب العین کی جستجو کے عمل میں اپنی ترقی اور توسیع کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور وہ نظریاتی جماعت جو خدا کے صحیح اور مکمل تصوّر پر مبنی ہو اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سے پہلے کسی نبی نے اپنی عملی زندگی کی مثال سے اس قدرتی جدوجہد کا نمونہ پیش نہیں کیا، جس میں سے مستقبل کی نوعِ انسانی کو خدا کے تصوّر پر مبنی ایک ریاست کی صورت میں منظّم ہونے، قائم رہنے اور ترقی کرنے اور اس طرح سے عالم انسانی کے ارتقاء کو جاری رکھنے کے لیے لازماً گزرنا ہے۔ اس جدوجہد کا نہایت ہی قیمتی اور روشنی اور ہدایت بخشنے والا نمونہ پہلی دفعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی نے مہیا کیا ہے اور یہی سبب ہے کہ حضور رحمۃ للعٰلمین ہیں۔

اجتہاد کی حقیقت

جب کوئی نظریۂ حیات اسلام کی طرح خدا کے کامل اور صحیح تصور پر مبنی ہو اور خدا کے ایسے تصوّر کو انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام اہم شعبوں (مثلاً اخلاق، سیاست، معاشیات، قانون، جنگ وغیرہ) پر چسپاں کرتا ہو تو اس کی زندگی یا ترقی کے امکانات کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو بعض وقت یہ محسوس کیا جائے کہ اس نظریۂ حیات میں انسانی زندگی کے ان شعبوں کے متعلق جو ہدایت ملتی ہے وہ ضروری حد تک مفصل نہیں، پھر بھی اس کی زندگی قائم رہتی ہے اور ایک تندرست جسم حیوانی کی طرح جو اپنے جسم کے نسبتاً غیر ضروری حصّوں میں کٹے ہوئے گوشت کو اپنے اعضائے رئیسہ کی صحت اور درستی عمل کی وجہ سے دوبارہ پیدا کر لیتا ہے ایسا نظریۂ حیات بھی ہدایت کی مطلوبہ تفصیلات کو اپنے اندر سے پیدا کر لیتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں مطلوبہ تصوّرات کی اس تخلیق کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔

اسلام کی پائداری کا سبب

چونکہ رحمۃ للعٰلمینؐ کا عطا کیا ہوا نظریۂ حیات خدا کے صحیح اور کامل تصوّر کو انسانی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں کرتا ہے اور لہٰذا نہ صرف اندرونی روح کے لحاظ سے بلکہ بیرونی صورت کے لحاظ سے بھی کامل ہے اس لیے اسلام نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ تمام نظریات پر غالب آئے گا اور دنیا کے کناروں تک پھیل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت بعض مخالف حالات اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی کے کسی پہلو سے خارج کر دیں تو یہ جبراً پھر ان کی زندگی کے اس پہلو میں

داخل ہوکر اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ جس طرح سے ایک مکمل طور پر صحت مند جسم حیوانی مرض کے خلاف ردِّ عمل کرتا ہے اور اپنی گرتی ہوئی صحت کو بحال کر لیتا ہے اس طرح سے اسلام ہر اُس غیر اسلامی تحریک کے خلاف جو اس کے اندر نمودار ہوکر اس کو مغلوب کرنا چاہتی ہے نہایت ہی قوّت اور کامیابی کے ساتھ ردِّ عمل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تحریک مٹ جاتی ہے اور اسلام اپنی اصلی حالت پر باقی رہ جاتا ہے۔ کئی صدیوں کے اندر پے بہ پے آنے والے شدید قسم کے حادثات کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کا موجود رہنا بے معنی نہیں، بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام مٹنے کے لیے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

نظریاتی ارتقاء کی شاہراہ

نظریاتی ارتقاء کا وہ راستہ جو پہلے نبی یعنی حضرت آدمؑ سے براہِ راست رحمۃ للعالمینؐ تک جاتا ہے نظریاتی ارتقاء کی شاہراہ ہے جس پر ارتقاء براہِ راست خالقِ کائنات کے مقصد کے مطابق ہوتا رہا ہے۔ اس شاہراہ کی ہر منزل پر نبوّتی نظریۂ حیات کی ایک نئی ترقی یافتہ صورت اس کو ماننے والی ایک امّت کے سمیت ایک نظریاتی تقلیب کے ذریعہ سے نمودار ہوتی رہی، تاہم اس شاہراہ کی مختلف منزلوں سے نظریاتی ارتقاء کے غلط راستے بھی نکلتے رہے، جن پر غلط نظریاتِ حیات اور ان کو ماننے والی غلط قسم کی نظریاتی جماعتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان راستوں پر ایک غلط نظریہ سے دوسرا بہتر لیکن غلط نظریہ نکلتا رہا اور اس طرح سے ان پر بھی ارتقاء جاری رہا لیکن تھوڑی دُور آگے جاکر ختم ہو گیا۔ ارتقاء کی شاہراہ سے ہٹ جانے کی وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ان راستوں میں سے کوئی راستہ بھی ارتقاء کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے گا، بلکہ ان راستوں پر ہر منزل نظریاتی ارتقاء کی منزلِ مقصود سے اور دُور ہوتی گئی۔ نظریاتی ارتقاء کی ان گمراہیوں کی وجہ یہ تھی کہ انبیاء کی امتوں میں بعض ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جن کو غلط قسم کا تعلیمی ماحول میسّر آیا جس کی وجہ سے نظریاتی تکمیل کے دباؤ نے جو ان کے اندر کام کر رہا تھا ان کی نظریاتی نشوونما کو غلط راستہ پر ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غلط

نظریۂ حیات کو پیش کرنے والا انسان اپنے غلط نظریہ کے کچھ عناصر صحیح نبوّتی نظریہ سے لیتا ہے اور اس میں کچھ غلط عناصر کی ملاوٹ کر کے ایک نیا نظریہ پیش کرتا ہے جو حق و باطل کی آمیزش کی وجہ سے کلیتہً باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر غلط نظریۂ حیات تعلیمِ نبوّت کا خوشہ چین ہے اور اپنی کامیابی کے لیے اس کے اجزاء عناصر کا مرہونِ منّت ہے۔ اگر وہ باطل کے ساتھ حق کی آمیزش نہ کرے تو اس کے اندر کوئی کشش باقی نہ رہے، لیکن حق و باطل کی آمیزش کی وجہ سے وہ کلیتہً باطل ہو کر رہ جاتا ہے، لہٰذا ناقابلِ قبول ہوتا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

بقیہ : ڈاکٹر طاہر سعید کے نام

کی صلاحیتوں کے اندر اس کے لیے مقدّر ہو چکی ہے تو اس بے خدا اور غلط تعلیم کا طلسم ٹوٹنا چاہیئے۔ لیکن مغرب جو اس طلسم کا خالق ہے اس کو توڑ نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم خدا کے عقیدہ کے خلاف ایک شدید قسم کے علمی تعصّب میں مبتلا ہیں۔ اسی تعصّب کی وجہ سے وہ خدا کے عقیدہ کو دنیوی اور عقلی علوم کے منافی سمجھتے ہیں اور اُن کا یہ دستور بن گیا ہے کہ جب بھی اُن کا علمی اور عقلی استدلال خود بخود اور بے ساختہ خدا کے تصوّر کی طرف جانے لگتا ہے، وہ بہ تکلّف اس کو گھما کر واپس لاتے ہیں خواہ اُن کا استدلال مضحکہ خیز کیوں نہ بن جائے۔"

ان تمام تصریحات و توضیحات سے جن کا ایک اجمالی تذکرہ صفحاتِ گذشتہ میں آچکا ہے، یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ غیر اسلامی دنیا ہو یا اسلامی دنیا، ہر چہار سو طاغوتی گمراہیوں اور شیطانی ضلالتوں کے خمیر سے زندگی کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظامِ اجتماعی کی بنیادیں نہایت مضبوطی سے جم چکی ہیں۔ اور یہ تخریب و بگاڑ جزوی یا سطحی نوعیت کا نہیں، بلکہ بنیادی اور کلّی ہے، جو تحت الثریٰ سے لے کر اوجِ ثریّا تک پوری انسانیت کو اپنے پنجۂ قہاری میں کسے ہوئے ہے۔

لغات واعراب قرآن (۱۷)
پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۲)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگراف) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر نشان ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ــــ وھکذا۔

۲:۱۲ أُولٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۶﴾

۲:۱۲:۱ اللغۃ

۲:۱۲:۱(۱) [أُولٰئِكَ] اسم اشارہ بعید برائے جمع (مذکر و مؤنث) ہے جس کا اردو ترجمہ "وہ سب" ہے۔ اس کی اصل اور بناوٹ کے بارے میں دیکھئے البقرہ: ۵ [۲:۴:۱(۱) میں] اور جملہ اسمائے اشارہ کے بارے میں دیکھئے البقرہ: ۲ [۲:۱:۱(۱) میں]

[**الَّذِيْنَ**] اسم موصول برائے جمع مذکر ہے جس کا اردو ترجمہ " جو لوگ کہ " یا " جن لوگوں نے کہ " یا " جنہوں نے کہ " ہو گا۔ اسمائے موصولہ پر الفاتحہ: ۷ [۱:۱:۶(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

[**اِشْتَرَوُا**] کا مادہ " ش ر ی " اور وزن اصلی " اِفْتَعَلُوْا " ہے۔ اس کی اصلی شکل " اِشْتَرَیُوا " تھی جس میں ناقص کے قاعدے کے مطابق واو الجمع سے ماقبل والا " لام کلمہ " (جو یہاں " ی " ہے) گر گیا۔ اور اس سے ماقبل (عین کلمہ) چونکہ مفتوح ہے لہٰذا اس کی فتحہ (ــَــ) برقرار رہی اور یوں لفظ " اِشْتَرَوْا " بن گیا۔ جس کو بصورتِ وصل (جب وقف نہ کیا جائے) سابقہ کلمہ (الَّذِین) کے ساتھ مل کر پڑھنے کے لیے ابتدائی ھمزۃ الوصل تلفظ میں نہیں آتا بلکہ " نَشْ " پڑھا جاتا ہے اور اسی (اِشْتَرَوْا) کو مابعد والے کلمہ (الضللۃ) سے ملانے کے لیے آخری ساکن واو (وْ) کو حرکت ضمہ (ــُــ) دی جاتی ہے[1] (اور تلفظ میں لفظ " الضلالۃ " کا ابتدائی ھمزۃ الوصل بھی گر جاتا ہے، تلفظ میں ساقط تمام حروف علاماتِ ضبط سے خالی رکھے جاتے ہیں۔

اس مادہ (ش ر ی) سے فعل ثلاثی مجرد " شَرَی ..... یَشْرِیُ شِرًی " (عموماً باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو ہیں " ..... کو بیچ دینا۔ کبھی یہ " خرید لینا " کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم زیادہ تر اس کے معنی

---

[1] اور یہ ضمہ (ــُــ) اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ واو الجمع ہے اگر اصلی (مادہ کی) واو ساکن ہو تو اسے عام قاعدے (اذا حُرِّكَ حُرِّكَ بالکسر) کے تحت کسرہ (ــِــ) ہی سے آگے ملاتے ہیں مثلاً " لَوِاسْتَطَعْنَا " کی " لَوْ " والی واو ساکنہ میں ـــ بعض نحویوں نے یہاں واو کو مضموم کر کے آگے ملانے کی کچھ اور وجوہ بھی بیان کی ہیں (بلکہ دور کی کوڑی لائے ہیں) آپ چاہیں تو دلچسپی کی خاطر دیکھئے ابن الانباری (البیان) ج ۱ ص ۵۸ ، عکبری (التبیان) ج ۱ ص ۳۲ اور القیسی (مشکل) ج ۱ ص ۲۶ ـــ

"بیچ دینا" ہی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مادہ (شری) اس باب ضرب سے بھی اور باب سمع سے بھی بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم میں اس فعل (ثلاثی مجرد) کے ماضی اور مضارع کے مختلف صیغے جو کُل چار جگہ آئے ہیں، ہر جگہ یہ باب ضرب سے اور "بیچنا" کے معنوں میں ہی آئے ہیں۔

زیر مطالعہ لفظ "اِشْتَرَوْا" اس مادہ (شری) سے باب افتعال کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ باب افتعال سے اس فعل "اشترَی.....یَشترِی اِشتراءً" کے معنی بنیادی طور پر تو "..... کو مول لے لینا" "خرید لینا" ہی ہوتے ہیں اور کہیں کہیں یہ "بیچ دینا" کے معنی بھی دیتا ہے۔ اور وجہ اس "اَضداد" کی یہ ہے کہ دراصل "خریدنا اور بیچنا" دو ایسے فعل ہیں جو بیک وقت سرانجام پاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ایک آدمی کوئی چیز "خرید رہا" ہوتا ہے اور اس کے ساتھ وہ اس چیز کا عوض (یا قیمت) "بیچ رہا" (دے رہا) ہوتا ہے۔ یہی حالت کوئی "چیز بیچ کر" اس کی قیمت "خرید کر" لینے والے کی ہوتی ہے۔

عربی زبان میں یہ دونوں فعل — شری (مجرد) اور اشتری (افتعال) — دونوں چیزوں — چیز اور قیمت کے لیے اس طرح استعمال ہوتے ہیں۔

شَرَی .. (۱) ... بِ .. (۲) = (۱) کو (۲) کے بدلے بیچ دینا یعنی (۱) دے کر اس کے عوض (۲) لے لینا۔ اشتری .. (۱) .... بِ .. (۲) = (۱) کو (۲) کے بدلے خرید لینا یعنی (۱) لے کر اس کے عوض (۲) دے دینا یعنی "شری کذا بکذا" میں بیچی جانے والی شے مفعول بنفسہ ہو کر آتی ہے اور جتنے میں وہ چیز بیچی یا جو عوض وصول کیا اس پہ باء (بِ) کا صلہ داخل ہوتا ہے اور "اشتری کذا بکذا" میں خریدی جانے والی شے تو مفعول بنفسہ ہو کر آتی ہے اور جتنے میں وہ چیز خریدی جائے یا جو عوض دیا جائے اس پہ باء (بِ) کا صلہ آتا ہے۔

آپ مندرجہ بالا استعمال کو سمجھ لینے سے اور اسے مدنظر رکھ کر حسب موقع ان افعال کا اردو ترجمہ "بیچنا" یا "خریدنا" کرنے کی وجہ معلوم کر سکیں گے۔ اگرچہ "شری"

زیادہ تر "بیچنا" اور "اشتری" زیادہ تر "خریدنا" کے لیے ہی مستعمل ہوتے ہیں۔ یہاں (زیرِ مطالعہ لفظ) "اشتروا" کا ترجمہ "انہوں نے مول لی، خرید لی، خرید کر لی، خریدی" ہو سکتا ہے۔

۲:۱۲:۱(۲) [الضَّلٰلَةَ] (یہ اس لفظ کی عام عربی املاء ہے۔ اس کے رسم عثمانی پر آگے بحث "الرسم" میں بات ہوگی)۔ اس لفظ کا مادہ "ض ل ل" اور وزن (لام تعریف نکال) "فَعَالَةٌ" ہے اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے معانی اور اس کے لازم و متعدی استعمال (مثلاً گمراہ ہونا، کھو جانا یا گم کر بیٹھنا، کھو دینا وغیرہ) پر الفاتحہ : ۷ [۱:۱:۶(۶)] میں تفصیلاً بات ہو چکی ہے۔ یہاں "الضلالة" کا ترجمہ "گمراہی" ہوگا۔

۲:۱۲:۱(۳) [بِالْهُدٰی] یہ بِ (کی بجائے) + الھدی (جس پر ابھی بات ہوگی) کا مرکب ہے۔ "الھدی" کا لام تعریف ہٹا دیں تو باقی "هُدًی" بچتا ہے۔ اس (هُدًی) کا مادہ "ہ د ی" اور وزن اصلی "فُعَلٌ" ہے جو تعلیل کے بعد "فُعًی" رہ گیا ہے۔ اس لفظ کی اصلی شکل "هُدَیٌ" تھی۔ یا یوں کہیے کہ تلفظ کے مطابق یہ "هُدَیُنْ" تھا۔ یاءِ متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدلی اور یہ "هُدَانْ" ہو گیا۔ التقاءِ ساکنین (یعنی دو ساکن ـــ الف اور نون ـــ اکٹھے ہونے) کے باعث الف گرا دیا گیا اور باقی لفظ "هُدَنْ" رہ گیا۔ یہ ملفوظی صورت ہے۔ اسی کی مکتوبی صورت (املاء) "هُدًی" ہے تاکہ معلوم رہے کہ اس کا لام کلمہ "ی" ہے۔ ریاضی کی زبان میں یہ تعلیل یوں بیان کی جا سکتی ہے۔ هُدَیٌ = هُدَیُنْ = هُدَانْ = هُدَنْ = هُدًی۔

اس مادہ (ھ د ی) سے فعل ثلاثی مجرد کے معنی اور استعمال پر اس سے پہلے الفاتحہ : ۶ [۱:۵:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ "ھدًی" فعل ثلاثی مجرد کا ایک مصدر ہے۔ اس کا ہم معنی دوسرا لفظ "ھدایۃ" بھی اسی فعل کا مصدر ہے جو باملاء "ہدایت" اردو میں اپنے اصل عربی معنی (رہنمائی) کے ساتھ مستعمل ہے۔ اس لیے اکثر مترجمین "ھدی" کا ترجمہ "ہدایت" ہی کرتے ہیں۔ لفظ "ھدی" مفرد

مرکب، معرفہ نکرہ اور مختلف اعرابی حالتوں کے ساتھ قرآن کریم میں بکثرت (۸۵ جگہ) وارد ہوا ہے۔ البتہ کلمہ "ھدایۃ" قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔

۲:۱۲:۱ (۴) [فَمَا رَبِحَتْ] یہ "فَ" (پس) + مَا (نہیں۔ نہ) + رَبِحَتْ کا مرکب ہے۔ اس میں آخری کلمہ "رَبِحَتْ" کا مادہ "ر ب ح" اور وزن "فَعِلَتْ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "رَبِحَ یَرْبَحُ رِبْحًا" (باب سمع سے) استعمال ہوتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں۔ "فائدہ پانا، نافع یا سودمند ہونا"، "فائدہ مند ہونا"، "نفع بخش ہونا" ــــ یعنی یہ فعل لازم ہے اس کا کوئی مفعول نہیں آتا ــــ مثلاً عربی میں یا تو کہیں گے "رَبِحَ الرَّجُلُ فِی تِجَارَتِہٖ" (آدمی نے فائدہ پایا۔ یا وہ نفع لایا ــــ اپنی تجارت میں)۔ اور اسی مضمون کو عربی محاورے میں یوں بھی ادا کرتے ہیں کہ "رَبِحَتْ تِجَارَتُہٗ" (اس کی تجارت فائدہ مند ہوئی، نفع لائی، نافع ہوئی، سودمند ہوئی، نفع بخش ہوئی) اردو میں بعض مترجمین نے فعل "رَبِحَتْ" کا ترجمہ فعل متعدی کی طرح "نفع دیا" کر لیا ہے۔ جسے صرف مفہوم یا محاورے کے لحاظ سے ہی درست کہا جا سکتا ہے۔ لفظ کے اعتبار سے یہ ترجمہ اس لیے درست نہیں ہے کہ "ربح" فعل لازم ہے اس کا مفعول نہیں ہوتا۔ یعنی عربی میں "ربحتہ تجارتہ" (اس کو اس کی تجارت نے نفع دیا) کہنا بالکل غلط ہے۔ اس مادہ (ربح) سے فعل مجرد کا صرف یہی ایک صیغہ قرآن کریم میں صرف اسی جگہ استعمال ہوا ہے۔

۲:۱۲:۱ (۵) [تِجَارَتُھُمْ] جو تجارۃ + ھم (ان کی) کا مرکب ہے۔ اس میں کلمہ "تجارۃٌ" کا مادہ "ت ج ر" اور وزن "فِعَالَۃٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "تَجَرَ یَتْجُرُ تِجَارَۃً" (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "سوداگری کرنا" ہیں۔ اور خود لفظ "تجارۃ" اردو میں "تجارت" کی املاء کے ساتھ اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ مستعمل ہے۔ اس لئے اس فعل کا ترجمہ "تجارت کرنا" بھی ہو سکتا ہے۔ اسی سے اسم فاعل "تاجر" (بمعنی سوداگر) بھی اردو میں متداول ہے۔

اس فعل (تجر یتجر) کا کوئی مفعول (بنفسہ) نہیں آتا اگر کہنا ہو کہ "فلاں چیز کی

تجارت کی" تو عربی میں اس کے لیے فعل کے بعد "فی "..... استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے تجَرَ فی الکُتُبِ (کتابوں کی تجارت کی) ــــ اس مادہ (تجر) کی ایک لفظی خصوصیت قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ واحد مستعمل مادہ ہے جس میں "ت" کے بعد "ج" ہے یعنی جس کا فاء کلمہ "ت" اور عین کلمہ "ج" ہے ۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کا صرف مصدر "تجارۃ" ہی معرفہ نکرہ اور مفرد یا مرکب صورت میں کل ۹ جگہ آیا ہے ۔ اس مصدر یا مادہ سے کوئی فعل یا کوئی اسم مشتق قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔

۲:۱۲:۱(۶) [وَمَا كَانُوْا] جو وَ + ما + کانوا تین کلمات کا مرکب ہے ان کلمات میں "وَ" کے معنی واستعمال پر الفاتحہ : ۵ [۱:۴:۱(۳)] میں اور "مَا" کے معانی پر البقرہ : ۳ [۲:۲:۱(۵)] میں اور "کانوا" کے مادہ ، وزن اور فعل مجرد کے معنی اور استعمال پر نیز "کانوا" کی اصل شکل (کَوَنُوا) اور اس میں واقع ہونے والی تعلیل وغیرہ کے بارے میں بھی البقرہ : ۱۰ [۲:۸:۱(۱۰)] میں بات ہو چکی ہے ۔ یہاں "وما کانوا" کا ترجمہ "اور نہ ہوئے وہ" یا بامحاورہ ترجمہ "اور نہ ہی وہ ہوئے / تھے" ہوگا ۔

۲:۱۲:۱(۷) [مُهْتَدِيْنَ] کا مادہ "ھ د ی" اور وزن اصلی "مُفْتَعِلِيْنَ" ہے ۔ اس کی اصلی شکل "مُهْتَدِيِيْنَ" تھی ۔ جس میں دو "یاء" جمع ہونے کے باعث اصل مادہ کی یاء (جو لام کلمہ ہے) گرا دی جاتی ہے اور یوں لفظ "مُهْتَدِيْن" رہ جاتا ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد اور اس کے معنی واستعمال پر الفاتحہ : ۶ [۱:۵:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ کلمہ "مھتدین" اس مادہ (ھدی) کے باب افتعال سے اسم الفاعل کا صیغہ جمع مذکر سالم ہے ۔ اور اس باب سے فعل "اِهتَدَی یھتَدِی اھتداءً" کے معنی ہیں : "راہ پانا ، ہدایت پانا ، ٹھیک طریقے پر چلنا" اور اس کے اسم فاعل "مُهْتَدِی" (بصیغۂ واحد) کے معنی ہوں گے :

" راہ پانے والا " ، " ہدایت پانے والا " ۔ بنیادی طور پر یہ فعل لازم ہے اور اپنے فعل ثلاثی مجرد کی مطاوعت کے لیے آتا ہے۔ یعنی عربی میں کہیں گے " ھَدَاہ فاھْتَدَی " (اس نے اس کو راہ دکھائی پس وہ راہ پا گیا)

کبھی اس فعل (اھتدی) کے ساتھ " اِلی " یا " لِ " (لام الجر) کا صلہ آتا ہے یعنی کہتے ہیں " اھتدی اِلی کذا یا اھتدی لِکذا " یعنی اس نے فلاں چیز (کذا) کی طرف راہ پائی۔ تاہم یہ صلہ والا استعمال قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ـــ اور کبھی اس فعل کے ساتھ فعل متعدی کی طرح ایک مفعول منصوب بھی آجاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں " اھتدی الطریقَ الی کذا (اس نے فلاں چیز کی طرف راہ پالی۔ یا اس کی طرف راہ پانے کا طلبگار ہوا)۔ اس طرح کے مفعول بنفسہ (کے ساتھ) آنے کی صرف ایک مثال قرآن کریم (النسا : ۹۸) میں آئی ہے۔ عربی زبان میں یہ فعل (مندرجہ بالا کے علاوہ) کچھ اور معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً " دلھن کو خاوند کے گھر بھیجنا " یا گھوڑے کا آگے رہنے والوں میں سے ہونا " ـــ تاہم یہ فعل قرآن کریم میں ان معنی کے لیے کہیں استعمال نہیں ہوا ـــ اس فعل (اھتدی) سے مختلف افعال اور اسماء مشتقہ قرآن کریم میں ساٹھ کے قریب مقامات پر وارد ہوئے ہیں اور ہر جگہ یہ اپنے بنیادی معنی " راہ پانا " ، " ہدایت پانا " ، " راہ راست پر قائم رہنا " ، " ٹھیک راستے پر چلنا " ، وغیرہ کے مفہوم کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

۲:۱۲:۲ الإعراب

(اولٰئک الذین اشتروا الضلٰلۃ بالھدٰی ـــ فما ربحت تجارتھم ـــ وما کانوا مھتدین ۝)

آیت زیر مطالعہ بنیادی طور پر تین جملوں پر مشتمل ہے جن کو ہم نے (اوپر) لکھتے وقت ایک فاصلہ (ـــ) سے الگ الگ کر دیا ہے پھر یہ تینوں جملے حروف عاطفہ (" فَ " اور " وَ ") سے باہم مربوط ہو کر ایک لمبا جملہ بناتے ہیں۔ اعراب کی تفصیل

یوں ہے :-

[اولئِکَ] اسم اشارہ صیغۂ جمع ہے جو یہاں مبتدأ ہے لہٰذا مرفوع ہے مبنی ہونے کے باعث علامتِ رفع ظاہر نہیں - [الذین] اسم موصول ہے جو اپنے (آگے آنے والے) صلہ کے ساتھ مل کر (اولئک کی) پہلی خبر بنے گا - لہٰذا یہ بھی یہاں (خبر ہوکر) مرفوع ہے - اور مبنی ہونے کے باعث اس میں بھی ظاہراً کوئی علامتِ رفع نہیں ہے - [اشْتَرَوُا] فعل ماضی معروف (جمع مذکر غائب) ہے جس میں ضمیر فاعلین " ھم " مستتر ہے (جو " الذین " کے لیے ہے) -

[الضلالۃ] فعل (اشتروا) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامتِ نصب آخری " ۃ " کی فتحہ (ــَـ) ہے - [بالھدی] جارّ (بِ) اور مجرور (الھدیٰ جس میں اسم مقصور ہونے کے باعث علامتِ جر ظاہر نہیں ہے) مل کر فعل " اشتروا " سے متعلق ہیں - یہ فعل مع ضمیر فاعل، مفعول اور متعلق فعل سب مل کر (یعنی اشتروا الضلالۃ بالھدی) اسم موصول " الذین " کا صلہ ہے اور صلہ موصول مل کر (الذین اشتروا الضلالۃ بالھدی) سب مبتدأ (اولئک) کی خبر اوّل بنتا ہے - جس کا ترجمہ لفظی ہوگا " وہ لوگ (ہیں) جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے " - بعض نے " خرید لی " کی بجائے صرف " لے لی " سے ترجمہ کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے - اسی طرح بعض نے " کے بدلے " کی بجائے " کو چھوڑ کر " ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی محاورے کے مطابق مگر لفظ سے ہٹ کر ہے -

[فما] میں " فَ " عاطفہ ہے جس میں تعقیب (پیچھے لگانا) کا مفہوم ہے - جیسے اردو میں " پس " (یعنی پھر نتیجہ یہ ہوا کہ) سے ظاہر کرتے ہیں - اور " مَا " نافیہ ہے (بمعنی نہیں یا نہ ہی) [ربِحَتْ] فعل ماضی صیغہ واحد مؤنث غائب ہے - اور فعل کی تأنیث فاعل (تجارۃٌ) کی تانیث کی وجہ سے ہے - [تجارتُھم] مضاف (تجارۃُ) اور مضاف الیہ (ھُم) مل کر (پورا مرکب اضافی) فاعل ہے - اسی لیے مضاف یعنی لفظ " تجارۃُ " مرفوع ہے - علامتِ رفع " تاء " کا ضمہ (ــُـ)

ہے ۔یہ منفی جملہ فعلیہ (فما ربحت تجارتھم) " اولٰئِکَ (مبتدأ) کی دوسری خبر بنتا ہے۔

[وَمَا] میں واو عاطفہ (بمعنی اور) ہے اور یہاں بھی " مَا " نافیہ ہے۔ (بمعنی " نہ " یا " نہ ہی ") [کانوا] فعل ناقص صیغہ ماضی جمع مذکر غائب ہے۔جس کا اسم " ھم " اس کی آخری واو الجمع سے معلوم ہوتا ہے۔[مھتدین] "کانوا" کی خبر (لھذا) منصوب ہے اور اس کی علامتِ نصب آخری " نون " سے ماقبل والی (ـِ یْ) ہے کیونکہ یہ جمع مذکر سالم کا صیغہ ہے جس کی علامتِ رفع " ـُ وْ " (نَ) اور نصب وجر " ـِ ی " (نَ) سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ آخری منفی جملہ اسمیہ (وما کانوا مھتدین) " اولٰئِکَ " کی تیسری خبر بنتا ہے۔اس طرح " وما کانوا مھتدین" کا ترجمہ ہوا " اور نہ ہی وہ ہوئے راہ پانے والے " اسی کا بامحاورہ ترجمہ بعض نے " اور نہ ہی وہ ٹھیک راستے پر چلے " اور بعض نے " وہ راہ راست پر قائم نہ رہے " کیا ہے جو اس لحاظ سے درست نہیں کہ جملہ اسمیہ کا ترجمہ جملہ فعلیہ سے کر دیا گیا ہے۔ اور بعض نے " وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے " سے ترجمہ کیا ہے جو سابقہ " ذکر تجارت " کی وجہ سے بامحاورہ تو کہا جا سکتا ہے مگر نص (اصل قرآنی عبارت) سے بہت دور ہے۔

۲:۱۲:۳ الرسم

(اولٰئِکَ الذین اشتروا الضلٰلۃ بالھدی فما ربحت تجارتھم
وما کانوا مھتدین)

زیر مطالعہ آیت میں بلحاظ رسم عثمانی صرف دو لفظ " الضلٰلۃ " اور " تجارتھم " تفصیل طلب ہیں۔باقی تمام کلمات کا رسمِ املائی اور رسم قرآنی یکساں ہے یہ بات پہلے مذکور ہو چکی ہے کہ " اولٰئِکَ " اور " الذین " کا یہ رسم (املائی) دراصل رسم املائی پر رسم عثمانی کے اثرات کا ایک نمونہ ہے۔

کلمہ "الضلالۃ" (یہ اس کا املائی رسم ہے) قرآن کریم میں ہر جگہ (اور یہ لفظ مفرد مرکب معرفہ نکرہ مختلف سورتوں میں قرآن کریم کے اندر نو جگہ آیا ہے) بحذف الف (بین اللامین) یعنی بصورت "الضللة" لکھا جاتا ہے اور یہ علمائے رسم کا متفقہ مسئلہ ہے۔ جن مصاحف (مثلاً ترکی اور ایران) میں اسے باثبات الف لکھا گیا ہے تو یہ رسم عثمانی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

لفظ "تجارتهم" کے ابتدائی حصے "تجارة" کی رسم املائی اسی طرح باثباتِ الف (بعد الجیم) ہے۔ یہ لفظ (تجارۃ) قرآن حکیم میں مفرد مرکب معرفہ نکرہ مختلف صورتوں میں کل نو جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ اس کے رسم عثمانی میں اس کے الف (بین الجیم والراء) کے حذف واثبات میں اختلاف ہے۔ الدانی نے اس کے محذوف الالف ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اور حذف پر عمل اسی صورت میں ہوتا ہے جب اس کی صراحت موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا کے مصحف میں اسے ہر جگہ باثبات الف "تجارة" لکھا گیا ہے۔ برصغیر میں صحت کے اہتمام سے شائع ہونے والے مصاحف (مثلاً انجمن حمایت اسلام کے نسخہ اور الفی قرآن مطبوعہ بمبئی) میں بھی اسے باثبات الف ہی لکھا گیا ہے۔ صاحب نثر المرجان نے خلاصۃ الرسوم کے حوالے سے اس کا باثباتِ الف لکھا جانا ہی بیان کیا ہے اور تمام مشرقی ممالک میں اسی پر عمل ہے۔ تاہم ابوداؤد (سلیمان بن نجاح) سے (مورد الظمآن وغیرہ میں) اس کلمہ (تجارۃ) کا بحذف الف لکھا جانا مروی ہے۔ شامی، مصری، سعودی اور بیشتر افریقی ممالک میں اسی (بصورت اختلاف الدانی کی بجائے ابوداؤد کو ترجیح دینے کی) وجہ سے اسے بحذف الف "تجرتهم" لکھا جاتا ہے۔

۲:۱۲:۴ الضبط

(اولٰئك الذين .... مهتدين ۝)

زیرِ مطالعہ آیت میں بلحاظ ضبط دو کلمات "اولٰئك" اور "الضللة" قابلِ توجہ ہیں "اولئك" کے ضبط کے مختلف پہلوؤں پر البقرہ: ۵ [۲:۴:۲(۹)]

میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے۔ ان دونوں کلمات کے ضبط میں " لام" کے بعد والے محذوف الف کو ظاہر کرنے کے طریقے کا اختلاف بہت دلچسپ اور متنوع ہے جیسا کہ آپ نیچے دیئے گئے نمونوں میں ملاحظہ کریں گے۔ باقی اختلافات وہی همزة الوصل، همزة القطع، زائد حروف پر علامت تنسیخ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ آیت کے تمام متفق یا مختلف ضبط والے کلمات کی مثالیں درج ذیل ہیں:-

أُولٰئِكَ ، أُولٰئِكَ ، أُوْلٰئِكَ ، أُوْلٰٓئِكَ ، أُولٰٓئِكَ۔

الَّذِيْنَ ، الَّذِينَ ، اَلَّذِيْنَ ، اَلَّذِينَ۔

اشْتَرَوُا ، اٰشْتَرَوُا ، اٰشْتَرَوُاْ۔

الضَّلٰلَةَ ، اٰلضَّلٰلَةَ ، اٰلضَّلٰلَةَ۔

بِالْهُدٰى ، بِاْلْهُدٰى ، بِالْهُدٰے

فَمَا ، فَمَا ، فَمَا

رَبِحَتْ ، رَبِحَت

تِجَارَتُهُمْ ، تِّجَارَتُهُمْ ، تِجٰرَتُهُمْ (بحذف الف)

وَمَا كَانُوْا ، وَمَا كَانُوا ، وَمَا كَانُوْا ، وَمَا كَانُوْا

مُهْتَدِيْنَ ، مُهْتَدِيْنَ ، مُهْتَدِينَ ، مُهْتَدِيْنَ۔

*

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۹)

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

اسلامی دُنیا کا خدا سے باغی نظامِ تعلیم

عملی مرعوبیّت

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ہم نے اپنی تعلیم گاہوں کے اندر کلیتہً مغربی اور یورپی ماحول پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ہمارے بچے انگریزی زبان بولیں، انگریزی لباس پہنیں اور ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوسرے عزیز و اقارب کو انگریزی زبان کے آداب و القاب سے پکاریں۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے کھیلنے کودنے اور ہنسنے چھینکنے میں ٹاٹا، ٹاٹا۔ ممّی۔ اور ڈیڈی، انکل، اور انٹی، پپّو۔ اور پپی، سسٹر اور برادر، ایٹ اور ڈرنک، سِٹ اور سٹینڈ اور گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ اور گڈ بائی ہی کے الفاظ بلا تکلّف استعمال کریں، تاکہ کوئی اُن پر قدامت پرستی اور پسماندگی کی پھبتی چُست نہ کر سکے۔ ہم نے اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو میڈیکل کالجوں میں ایک ہی کلاس روم، ایک ہی وارڈ اور ایک ہی لیبارٹری میں خلط ملط ہونے اور شانہ بشانہ چلنے کی بھرپور تربیت دی تاکہ اگر اُن کے اندر اسلامی حیاء کی کوئی رمق باقی ہو تو اُسے بھی جڑ بنیاد سے اُکھیڑ دیا جائے۔ خود ہم نے اور ہماری کتابوں نے اُن کے سامنے صدیق رضؓ و عمر رضؓ اور خالد رضؓ و علی رضؓ کی بجائے ابراہام لنکن اور نپولین بوناپارٹ اور رومیؒ و غزالیؒ کی جگہ اسپنسر اور مِل اور سٹالن اور چرچل کے گیت گائے۔ چنانچہ اکبر کے بقول ؎

غزالی و رومی کی بھلا کون سُنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مِل ہے

دوسرا بڑا اور عظیم ظلم ہم نے یہ کیا کہ دن بھر کی تھکان اور بوریت کو دُور کرنے کے لیے سکولوں اور کالجوں میں آخری گھنٹہ (PERIOD) اسلامیات کے لیے

وقف کر دیا اور تجربہ گواہ ہے کہ یہی آخری پیریڈ ہمیشہ تفریح و فراغت اور ہنسی مذاق کا پیریڈ رہا ہے۔ اس سے جذبۂ دین و اسلام میں اضافہ تو کیا ہوتا اُلٹا طلباء کے دلوں میں رہی سہی رُوحِ ایمانی کا بھی، ہم نے نہایت دھوم سے جنازہ نکال دیا۔ اس کا نتیجہ یہی برآمد ہونا تھا اور فی الواقع یہی ہُوا کہ دین طلباء کی نگاہوں سے گر گیا اور اسلامی ارکان اُنھیں ڈھکوسلے نظر آنے لگے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب ہم نے اپنے طلباء کے سامنے اپنے دین کو فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور تاریخ سے کم تر اور حقیر تر بنا کر پیش کیا تو ہمیں اس جرمِ عظیم کی کم سے کم نقد سزا غیرت مند خدا کی جانب سے یہ ملی کہ ہمارے "بچے" اور طلباء خود ہماری آنکھوں کے سامنے لغو اور بیہودہ قسم کی کلبوں کے ممبر، مینا بازاروں کے اہل کار، رقص و سرود اور شراب و قمار کی محفلوں کے فن کار اور موسیقار، اسٹوڈیوز کے گلوکار اور فحش و عُریاں فلموں کے اداکار بن گئے۔ اُن کا سارا دفترِ علم ع "علم را برتن زنی مارے بود" کے مصداق جب خدا کے تصوّر سے باغی ہو گیا تو وہ تلذّذ و تعیّش کا بدترین قلادہ اپنے گلے میں ڈال کر لذّات و خواہشاتِ نفسانی کے غلام و اسیر بن کر رہ گئے۔

انہی طلباء اور نوجوانوں نے اس بے خدا علم کے ایک منطقی نتیجے کے طور پر جب اپنی بدن پرستی، فیشن اور تن پروری کے لیے اپنے بزرگوں سے "مسجد کے زیرِ سایہ خرابات" بنانے کا مطالبہ کیا تو وہ چراغ پا ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ یہ کونسا طوفانِ بدتمیزی ہے جو اس نئی نسل نے برپا کر دیا ہے اور خرابیٔ دماغ کا یہ کیسا عارضہ ہے جو نسلِ نو کو لاحق ہو گیا ہے۔ مگر زمانے نے ثابت کیا اور تجربات و حوادث نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ خرابیٔ دماغ کی اس بیماری میں پہلی بار نسلِ جدید مبتلا نہیں ہوئی تھی بلکہ اُن کے وہ بڈھے بوڑھے "مرشدانِ خود بین"، خود اپنی اولاد کو بے خدا کتابیں اور ماحول دے کر اسی خرابیٔ دماغ یا پاگل پن کے شکار ہو چکے تھے۔ اور اگر یہ بے خدا نظامِ تعلیم اور غلامانہ ماحول مزید برقرار رہا تو ہمیں روزِ روشن کی طرح صاف نظر آ جائے گا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مخلوط ہنگاموں اور سیاسی د

انتخابی ہتھکنڈوں میں درندگی، چالاکی اور حیوانیت کے جو ریکارڈ یہ" اسلامی نوجوان نسل" قائم کر چکی ہے وہ کبھی جنگل کے بھیڑیے اور صحراؤں کی لومڑیاں بھی قائم نہ کر سکے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہی نسل (اگر ان کی بروقت اصلاح نہ کی گئی) جمہوریت و سیاست کی گدی پر متمکن ہو جائے تو ابلیس کو خداوندِ جہاں کے حضور یہ استعفا دینا پڑے کہ بے خدا نظامِ تعلیم کی فیکٹریوں سے برآمد شدہ انسان نما حیوانوں کی موجودگی میں اب زمین پر میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

نوجوان نسل کی بے راہ روی کا یہ خاکہ جو میں نے اُردو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے اِس سے ملتا جلتا دردِ دل اقبالؔ سے فارسی زبان میں سُنیے ؎

۱۔ بے نصیب آمد ز اولادِ غیور — جاں بہ تن چوں مُردۂ در خاکِ گور
۲۔ از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چُوں زناں مشغولِ تن
۳۔ در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات — مُردہ زایند از بطونِ اُمّہات
۴۔ دخترانِ اُو بہ زُلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خود نُما و خوردہ گیر
۵۔ ابرواں مثلِ دو تیغِ آختہ — ساختہ، پرداختہ، دل باختہ

ترجمۂ اشعار:

۱۔ قوم کی مائیں غیرت مند اولاد سے محروم ہو گئیں۔ ان کے بچوں کے جسم میں جان کی مثال ایسی ہے جیسے قبر کے اندر مُردہ دفن ہو۔
۲۔ بڑے بوڑھے حیا سے بیگانہ ہو چکے ہیں اور نوجوان عورتوں کی طرح اپنا جسم سنوارنے میں مشغول رہتے ہیں۔
۳۔ ان کے دلوں میں جلد مٹ جانے والی فانی آرزوئیں اور تمنائیں ہی ہوتی ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے ماؤں کے پیٹ سے وہ مُردہ پیدا ہو گئے ہیں۔
۴۔ اس قوم کی لڑکیاں اپنے بالوں اور زلفوں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے

کی دُھن میں لگی ہوئی ہیں جو شوخ چشم، دوسروں کی عیب جوئی کرنے والیاں اور اپنے حسن کی نمائش کرنے والیاں بن چکی ہیں۔

۵۔ اُن کے ابرو دوسو نتی ہوئی تلواروں کی طرح ہوتے ہیں اور وہ آراستہ و پیراستہ اور دل باختہ ہوتی ہیں۔

اسی طرح دخترانِ ملّت کی بے مقصد یت، بے راہ روی اور حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتے ہوئے فرمایا: ؎

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ظاہرش زن، باطنِ او نازن است
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش از حیا ناآشنا آزادیش!

ترجمہ: اِس قوم کی لڑکیاں مغربی افکار و نظریات اور ظاہری چمک دمک سے متاثر ہیں۔ بظاہر تو وہ عورت نظر آتی ہے مگر حقیقت میں وہ زنانہ صفات سے عاری ہو کر نامعورت بن گئی ہے۔ حیا سے بالکل ناآشنا اور شوخی اور فتنہ جوئی کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی پابندی سے بالکل آزاد سمجھتی ہے۔

یہ تھے ایک غلط اور بے خدا نظامِ تعلیم کے نہایت دُور رس اور زہر یلے اثرات جس نے پوری دنیا کے اندر نسلِ جدید کے دماغوں کو پراگندہ کر کے بے خدا بنا دیا اسی صورتِ حال اور بے خدا نظامِ تعلیم کی اس عمومی تباہی اور ذہنی و فکری خود کشی پر ڈاکٹر محمد رفیع الدّین مرحوم اپنے ایک ایمان افروز مقالے میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس وقت عالمِ انسانی میں کوئی بھی نظامِ تعلیم ایسا نہیں جو تعلیم کو ایک اندرونی نشوونما کے عمل کی حیثیت سے اپنا صحیح اور قدرتی راستہ اختیار کرنے کے لیے آزاد چھوڑتا ہو۔ بلکہ جس طرح سے آم کا نوخیز پودا ایک طرف دباؤ پڑنے سے اُگنے کے باوجود ٹیڑھا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جھک کر زمین سے لگ جاتا ہے، اسی طرح سے اس وقت دنیا کے ہر نظامِ تعلیم کے اندر کسی نہ کسی غلط اور ناقص مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم کا دباؤ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصیتوں کو ٹیڑھا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب ٹیڑھی اور غیر قدرتی نشوونما پانے والی شخصیتوں نے

عالمِ انسانی کو بھر دیا ہے۔ کوئی تعجّب نہیں کہ طفولیتی بے راہ روی (DELIQUENCY) کی حدود ہر روز پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجّب نہیں کہ امریکہ کی مخلوط یونیورسٹیوں میں آزادانہ جنسی میل جول کی شرمناک تحریکیں اربابِ اختیار کی چشم پوشی سے ہی نہیں، بلکہ سرپرستی میں کھلم کھلا منظّم کی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجّب نہیں کہ خودکشیوں، ڈکیتیوں، قتلوں اور دوسرے جرموں کے اعداد و شمار بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی تعجّب نہیں کہ اس وقت عالمِ انسانی ہر لمحہ ایک عالم گیر جنگ کی تباہ کاریوں کا خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ کوئی تعجّب نہیں کہ اقتصادی خوشحالی کے باوجود مہذّب اور ترقی یافتہ لوگوں کے دل بے قرار اور زندگی سے بیزار ہیں۔ اس وقت نوعِ انسان کی سب سے بڑی بدبختی ایٹم بموں اور میزائلوں کے جا بجا پھیلے ہوئے انبار نہیں، بلکہ غلط اور بے خدا تعلیم کی عالمگیری ہے جس سے انسان کی اور تمام بدبختیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت ہمارا پاکستانی نظامِ تعلیم بھی، جس کو ہم نے اسلامیات کا ایک مضمون شامل کر کے صحیح بنانے کی کوشش کی ہے، مغرب کے بے خدا اور غلط نظام ہائے تعلیم کی ایک بھونڈی نقل ہے۔ اسلامیات کا مضمون شامل کرنے سے اس کے اساسی لادینی مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتّہ پاکستانی طالب علم کے ذہن میں یہ بات اور واضح ہو گئی ہے کہ یونیورسٹی کے اصل علوم کے ساتھ جو پورے نصاب کا پچانوے فی صد حصّہ ہیں، اسلام یا اسلامیات کا کوئی تعلق نہیں۔"

پھر اسی قصّۂ درد کو سناتے سناتے مزید آگے جا کر مرحوم ڈاکٹر صاحب موصوف ایک آہِ سوز کے ساتھ لکھتے ہیں:

"اگر نوعِ انسانی نے زندہ رہنا ہے اور پھر اگر اس نے امن و اتحاد کی نعمتوں سے ہمکنار ہونا ہے، اگر اس نے اپنی علمی، اخلاقی، جمالیاتی، روحانی اور مادی ترقیوں کی اس انتہا تک پہنچنا ہے جو اس کی فطرت

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

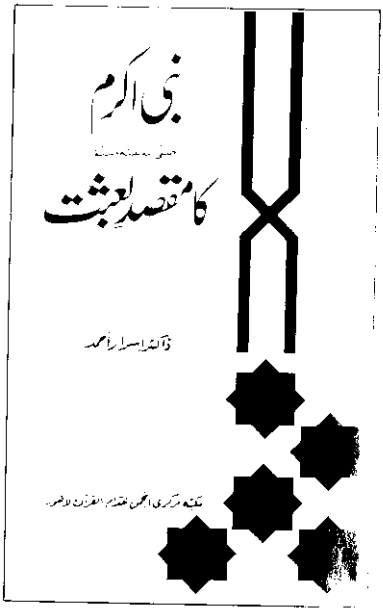

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

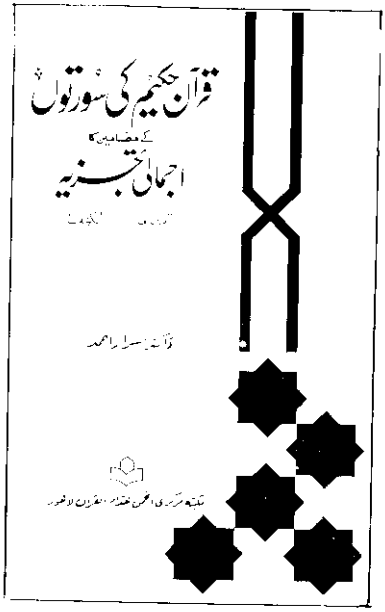

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

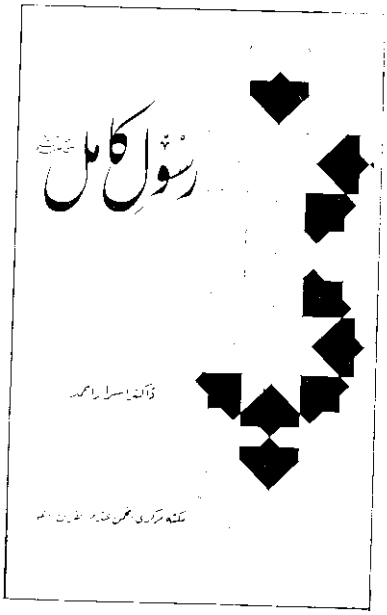

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

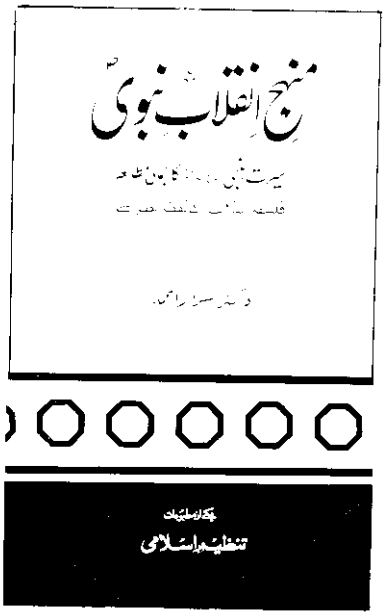

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

OCTOBER 1990 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 10

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ